جنوری ۱۹۸۷ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سندھ کا مسئلہ

مرکزی مکتبہ تنظیم اسلامی

۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور

بالکل مفت

آپکی لائبریری کیلئے قیمتی تحفہ

میثاق لاہور کی پیشکش سے آج ہی فائدہ اٹھائیے

جنوری ۸۷ء کے دوران سالانہ خریدار بننے یا خریداری کی تجدید کرنیوالے حضرات کی خدمت میں ادارہ کی جانب سے

✪ محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ۸۰ صفحات پر مشتمل معرکتہ الآرا تالیف:

"اسلام کا معاشی نظام" — اور

✪ پورے سال کے پرچے محفوظ رکھنے کے لیے خوبصورت اور پائیدار کور

سالانہ زرتعاون بذریعہ منی آرڈر -/ ۵۰ روپے

" " " " وی پی پی -/ ۵۵ روپے

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

اسعودی عرب، کویت، دوبئی، دوہا، قطر، متحدہ عرب امارات — ۲۵ سعودی ریال یا -/ ۱۵۰ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر — ۶ - امریکی ڈالر یا -/ ۱۰۰ روپے پاکستانی

یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ — ۹ - امریکی ڈالر یا -/ ۱۵۰ " "

شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ — ۱۲ - امریکی ڈالر یا -/ ۲۰۰ " "

ترسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ

۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن لاہور - ۱۴ (پاکستان) لاہور

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

11/16/36

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد ۳۶

شمارہ ۱

جنوری ۱۹۸۷ء

بمطابق

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۷ھ

زرِ سالانہ ۵۰ روپے

فی شمارہ ۵/- روپے

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمن

مولانا محمد سعید الرحمن علوی

حافظ عاکف سعید

مینجنگ ایڈیٹر: اقتدار احمد

مکتبہ تنظیم اسلامی ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴ فون ۸۵۲۶۸۳

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ، شاہراہ لیاقت کراچی: فون ۲۱۶۵۸۲

مشمولات

- عرضِ احوال ——— ۳
  اقتدار احمد
- "سندھ کا مسئلہ" اور قارئین ——— ۹
  (i) میر ہوت علی تالپور
  (ii) حسن احمد صدیقی
  (iii) آئی آئی کاکا
- سندھ کا مسئلہ ——— ۱۷
  — تمہید
  — قدیم سندھی مسلمانوں کی عمومی بے چینی کے عناصرِ ثلاثہ
  — مہاجرین کا ردِ عمل
  — جنرل ضیاء الحق کا دورِ حکومت اور موجودہ صورتِ حال
  ڈاکٹر اسرار احمد
- الھدیٰ (قرآن) ——— ۷۷
  بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال
  ڈاکٹر اسرار احمد
- تعزیتی خطوط ——— ۸۷
  (i) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
  (ii) ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی
- روشن چہرے ——— ۹۲
  صبرِ جمیل کی کہکشاں، رضیہ
  حافظ افروغ حسن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اقتدار احمد

عرضِ احوال

اس بار "میثاق" کا جزوِ اعظم امیرِ تنظیمِ اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیرِ تصنیف کتاب "پاکستان میں اسلامی انقلاب: کیا، کیوں اور کیسے!!!" کا دوسرا حصّہ ہے، پہلا حصّہ پچھلے ماہ اس جریدے میں شائع ہوچکا ہے اور ان شاء اللہ اگلے ماہ موضوع زیرِ بحث یعنی سندھ کی صورتحال کا تجزیہ مکمل ہوجائے گا۔ کتاب کا یہ جزو جسے ایک مبسوط اور موضوع کے ہر پہلو پر محیط تجزیاتی مقالہ کہنا زیادہ موزوں ہے، ایک تاریخی دستاویز ہے اور شاید مستقبل کا مؤرخ ہی اس کی ثقاہت پر مہرِ تصدیق ثبت کرے۔ مگر یہ اندیشہ ہے کہ آج اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں معدودے چند غیر جانبدار اور وطن کا درد رکھنے والے طبقات کے سوا اکثر اہلِ وطن بخل سے کام لیں گے۔ بہت سے تو جناب اصغر خاں صاحب کی طرح ؏ "پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے" کے انداز میں "ڈاکٹر اسرار احمد کون ہیں؟" کہہ کر ہی راہ لیں گے اور ایک بڑی تعداد سیاسی دھڑے بندیوں، گروہی مفادات اور جماعتی تعصبات کی اسیری کے باعث اسے لائقِ اعتناء نہ سمجھے گی۔ رہے ہمارے "دانشور" تو وہ اس "بنیاد پرست" مولوی کو اپنے کنبے قبیلے کا آدمی مانتے ہی کب ہیں۔

"مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید!" کے مصداق یہ مقالہ اپنے زورِ استدلال اور اپنی واقعیت و حقانیت کو خود ہی منوالے گا۔ ہمیں اس کی مدح سرائی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ان شاء اللہ محولہ بالا حضرات بھی اقرار باللسان کریں نہ کریں اس کے برمحل اور حاملِ افادیت ہونے کو دل سے تسلیم کریں گے۔ قارئینِ میثاق کو یہ بات ہم بہرحال یاد دلائیں گے کہ سندھ کی صورتحال کا یہ تجزیہ کراچی کے حالیہ ہولناک نسلی فسادات کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے سپردِ قلم کیا گیا تھا اور "جنگ" کے صفحات اس پر گواہ ہیں۔ کیا اس میں لکھے گئے بعض جملے کے جملے ان پیشینگوئیوں میں شمار نہیں ہوتے جو پوری ہوچکی ہیں؟ ایک طرف حالات اور ان کے محرکات و پس منظر کا یہ دردمندانہ تجزیہ جسے پڑھ کر ہر سلیم الفطرت پاکستانی محسوس کرے گا کہ ؏ "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا"۔ اور دوسری طرف ملکِ عزیز کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک

شخصیت کا یہ "انکشاف"، جو نوائے وقت میں یوں ثانوی شہ سرخی بنا کہ "فسادات میں تخریبی عناصر کا ہاتھ ہے"، ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا لکھئے۔ ہمارے روائتی کردار حضرت لال بجھکڑ کی رُوح پھڑک اٹھی ہوگی جنہوں نے ایک چوری کی تفتیش کے خواہشمند لوگوں سے حد درجہ تیقن کے ساتھ کہا تھا کہ ـــــ میں سمجھ گیا ہوں یہ کس کا کام ہے اور پھر گوش بر آواز سامعین کو بتایا "یہ حرکت یقیناً کسی چور ہی کی ہے"۔

اس خاکسار راقم کے ایک اعلیٰ تعلیمیافتہ دوست جو سیاسیاتِ عالم اور عمرانیات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب محترم کو اکثر سنتے ہیں، اس مقالے کی اوّلین چند قسطیں پڑھ کر ہی متحیّر اور مبہوت سے ہوگئے۔ بے ساختہ بولے کہ انہیں ہرگز اندازہ نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب قرآن مجید کے متعلّم و معلّم ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کے تاریخی و عمرانی پس منظر کا اتنا گہرا مطالعہ اور موجودہ حالات کا اس قدر عمیق مشاہدہ بھی رکھتے ہیں، اس پر خاکسار کو یاد آیا کہ اسلام کے معاشی نظام کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب محترم کی تقریر سن کر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے اس وقت کے وائس چانسلر جناب ڈاکٹر غلام رسول صاحب بھی ایسے ہی تحیّر کا شکار ہوئے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے اہتمام سے اس تقریر کو پمفلٹ کی شکل میں بڑے پیمانے پر مفت تقسیم کے لئے شائع کیا اور دیباچہ میں لکھا:۔

"ڈاکٹر صاحب کے اس خطاب سے جہاں اسلام کی تعلیمات کے نئے گوشے سامنے آئے وہاں یہ امر سب حاضرین کے لئے حیرت کا باعث ہوا کہ ڈاکٹر صاحب معاشیات کے نہ تو کبھی طالب علم رہے تھے اور نہ ہی اس شعبہ سے کبھی متعلق۔ لیکن اپنی بصیرتِ باطنی کی بنیاد پر ڈاکٹر صاحب ایک بہت بڑے معیشت دان معلوم ہو رہے تھے۔"

گویا ؎ ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

واقعہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالےٰ نے کسی اہلِ علم کو ذہانت و فطانت اور سلامتیٔ طبع کے ساتھ مقصد سے خلوص اور موضوع سے بے لوث وابستگی بھی عطا فرمائی ہو تو وہ کسی بھی میدان میں ٹھوکر نہیں کھاتا۔ ایک علیم و حکیم ذات قدم بقدم اس کی رہنمائی فرماتی ہے۔

حاشیہ کے ایک نوٹ میں ڈاکٹر صاحب نے سندھ کی زمینوں کے ہندو ساہوکاروں کے غاصبانہ قبضے میں رہ جانے میں قیام پاکستان سے متصلاً قبل خود سندھ کے مسلمان سیاستدانوں

اور وڈیروں کے کردار کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ سارا قصہ گھوٹکی (سندھ) میں انہیں ایک بزرگ نے سنایا جن کی یادداشت میں سب واقعات تقریباً محفوظ تھے۔ اب رفیقِ محترم نجیب صدیقی صاحب (سکھر) نے جو اُس وقت بھی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ تھے ایک بار ان صاحب سے مل کر واقعات کی ترتیب حاصل کی ہے۔ ان کا نام ماسٹر اللہ ڈنہ رکھا ہے اور وہ ایک قدیم سندھی ہونے کے علاوہ علاقے کی ایک معروف سماجی و سیاسی شخصیت ہیں ان کی روایت کا خلاصہ کچھ یوں ہے

—— ۱۹۳۶ء کے صوبائی انتخاب میں جو غیر جماعتی لیکن حُدا گانہ بنیاد پر ہوئے تھے سندھ میں مسلمانوں نے ساٹھ میں سے پینتیس ۳۵ نشستیں لے کر حکومت بنائی۔ پہلے وزیرِ اعلیٰ سر غلام حسین ہدایت اللہ تھے۔

—— مارچ ۱۹۳۸ء میں صوبائی اسمبلی کے ایجنڈے پر چار بل تھے (۱) انتقالِ اراضی کا بل جس کی رو سے ہر اُس سندھی کو اپنی زمین واپس ملتی جو ۱۹۰۱ء میں مالک تھا لیکن بعد میں کسی بھی وجہ (بشمول رہن) سے محروم ہو گیا (۲) قرض بل جس کا منشا یہ تھا کہ تمام قرض (جو ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے مسلمان زمینداروں پر تھے) بلا سود ہو جائیں گے اور بالاقساط واپس ہوں گے (۳) سُود بل یعنی ہر طرح کے سود کی منسوخی اور قرض کے صرف اصل زر کی واپسی اور (۴) شرعی بل جس کے ذریعے چیدہ چیدہ شرعی قوانین نافذ کیے جانے مقصود تھے۔

—— مارچ ۱۹۳۸ء تک تمام (یعنی پینتیس ۳۵) مسلمان ممبرانِ اسمبلی ایک حلف کے تحت متحد تھے چنانچہ ۱۹۳۸ء میں بجٹ بھی متفقہ طور پر پاس ہوا لیکن اس خاص اجلاس میں محرم اور ہولی کی تعطیلات کے باعث پانچ دنوں کا وقفہ ہو گیا۔

—— ان پانچ دنوں میں ہندوؤں نے مِل جُل کر سات مسلمان ارکانِ اسمبلی کو "توڑ" لیا۔ تین نام ماسٹر صاحب کو یاد نہیں (ریکارڈ میں بہرحال محفوظ ہوں گے) باقی چار "اسمائے گرامی" تھے: جناب جی ایم سیّد، پیرزادہ عبدالستار، پیر الٰہی بخش اور اللہ بخش سومرو۔

—— ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو اجلاس وقفہ کے بعد دوبارہ شروع ہوا تو سر غلام حسین ہدایت اللہ کے خلاف تحریکِ عدم اعتماد لے آئی گئی۔ سر غلام حسین نے انتظار کی درخواست کی تاکہ سات "غیر حاضر" مسلمان ارکانِ اسمبلی میں پہنچ جائیں لیکن

"وہ سات" نہ آنے تھے نہ آئے، وہ طلائی زنجیروں میں جکڑے جا چکے تھے یا طلسم سامری کے اسیر ہو چکے تھے۔ چنانچہ سپیکر (بھوج سنگھ وکیل) نے شام تک بحث کے بعد جب رائے شماری کرائی تو ساٹھ کے ایوان میں بتیس (۳۲) کی اکثریت اٹھائیس (۲۸) کی اقلیت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

—— سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت ختم ہوئی اور "اُن سات" میں کے "ایک" اللہ بخش سومرو نے وزیرِ اعلیٰ ہوئے اور اسی کے ساتھ اُن چاروں بلوں کی بساط لپیٹ گئی جو سندھی مسلمانوں کے لئے حیاتِ نو کی نوید جانفزا بنتے

میثاق کے صفحات میں گنجائش ہوئی تو انشاء اللہ اگلے ماہ نجیب صدیقی صاحب کا اصل خط شائع کر دیا جائے گا تاکہ دجل و دسیسہ کاری کی یہ داستان پوری تفصیل سے ریکارڈ پر آ جائے۔

افکار و آراء کے سلسلے میں یہ شمارہ بہت سے قیمتی خطوط اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان میں سے تین خطوط کا تعلق 'مسئلہ سندھ' سے ہے:

آئی آئی کا کا صاحب کا خط چند روز پہلے تک بڑا ہی دُکھ بھرا لگتا تھا لیکن اب تو اُس سے کہیں زیادہ دردناک کہانیاں اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ ذرا تخیل کو مہمیز دیجئے اور سوچئے کہ کراچی کے چوّن سال میں سرد ترین دن میں جن لوگوں کو گولیوں اور خنجروں کے زخم آئے اُن کی ٹیسیں کیسی ہوں گی۔ جن خواتین اور معصوم بچوں نے اپنے خاکستر گھروں کے باہر یخ بستہ شب بسر کی اس رات کے گھنٹے کتنے طویل ہوں گے۔ جو لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے وہ تو ان تمام مصائب و شدائد سے نجات پا گئے، ان کے لئے آگ میں کوئلہ ہو جانا یا سردی میں اکڑ جانا برابر تھا لیکن پس ماندگان پر کیا گذری ہو گی۔ فاعتبروا یا اولی الابصار ——

میر ہوت علی تالپور کا خط بھتوں کی آنکھیں کھولنے کی سعی (شاید لاحاصل) ہے —— "مَروِیسوں سندھ نہ ڈیسوں" کی تکرار اور اس کا مفہوم آپ انہی کی تحریر میں دیکھئے۔ ہمیں اس خط سے متعلق ایک ناگوار واقعہ کا ذکر کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ یہ خط لگ بھگ پانچ ماہ قبل روزنامہ جنگ کراچی کو موصول ہوا تھا لیکن اسے ۲۳ نومبر کو محض اتفاقاً ہمارے حوالے کرنے سے پہلے کھول کر دیکھا بھی نہ گیا۔ معلوم ہوا کہ امیرِ محترم کے گذشتہ سلسلہ مضامین

(استحکامِ پاکستان) پر بہت سے خطوط انہیں پہنچے تھے جو سب تغافل کا شکار ہوئے۔ ہم جہاں "جنگ" کے ممنونِ احسان ہیں کہ اُس نے ہماری آواز ایک وسیع حلقے میں پہنچانے کا کام قرینے سے انجام دیا وہاں اس تغافل پر شاکی بھی ہیں۔ نجانے کتنے بندگانِ خدا کے ذہن صاف کرنے کا موقع ہمیں مل جاتا اگر "جنگ"، متعلقہ ڈاک ہم تک پہنچانے کے اہتمام میں بھی سلیقہ برت لیتا۔

حسن احمد صدیقی صاحب سندھ کے حالات کا تجزیہ ایک اور زاویے سے کرتے ہیں تاہم ہماری رائے یہ ہے کہ صدیقی صاحب کا مطالعہ خاصا ہی جزدی اور سطحی ہے۔

برِصغیر ہند و پاک بلکہ عالمِ اسلام کی بزرگ ترین بقیدِ حیات دینی شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مکتوبِ گرامی اگرچہ تعزیتی خطوط کے ذیل میں آتا ہے لیکن اس میں تعزیت کا ایک نیا اسلوب سامنے آیا۔ مولانا علی میاں (اللہ تعالیٰ اُمت پر ان کا سایہ تادیر باقی رکھے) خود اسی نوع کی آزمائش یعنی نقصٍ من الانفس کا مواجہہ کر چکے ہیں لہٰذا انہوں نے ہمارے دکھ کو جیسے محسوس کیا ویسے ہمارے دوسرے بزرگ اور احباب شائد ہی محسوس کر سکے ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سانحے نے خود ان کے زخم کو ہرا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی صبرِ جمیل کی توفیق عطا کئے رکھے اور تلافیٔ مافات کی کوئی شکل نکالے اور ہم پر بھی اس کرم کی ارزانی فرمائے۔ آمین۔ اگرچہ بہت دِلوں سے مولانا نے بقلم خود خطوط نویسی کو اپنے معمولات سے خارج کر رکھا ہے لیکن دردِ مشترک کے باعث یہ خط از اوّل تا آخر بشمول مکتوب الیہ کا پتہ (بزبان انگریزی) مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہم مولانا کے اس لُطفِ خاص کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر شیر بہادر پنی کا نام قارئینِ میثاق کی اکثریت کے لئے اجنبی نہیں۔ اُن کا کرب جس طرح ان کے مکتوب سے چھلک رہا ہے وہ دیدنی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے المیوں کے شکار عمر کی آخری منزلوں سے گذرتے بزرگ ہر جگہ آس پاس موجود ہیں۔ یادش بخیر لاہور میں تنظیم اسلامی کے ایک محترم اور سالخوردہ رفیق جن کے تین بیٹے دیارِ غیر میں جا بسے ہیں جبکہ چوتھا اور آخری اگرچہ ابھی تعلیم کے وسطی مرحلے میں ہے تاہم وہ بھی پرواز کے لئے پر پھیلائے رہتا ہے، ایک بار خاکسار کے قریب بیٹھے امیرِ محترم سے سورۃ المدثر کا درس سُن رہے تھے، جب وَبَنِینَ شُہُودًا

کا مقام آیا اور اس کی شرح ڈاکٹر صاحب نے بیان کی تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھالر لٹک آئی تھی ـــــ پھر جب کچھ لوگ کسی بھی جذبہ کے تحت وطن مراجعت کی ٹھان لیں تو اُن پر یہاں جو بیتتی ہے اس میں بھی خیریت کا کوئی پہلو نہیں۔ ایک کھلا راز ہے کہ انہیں اپنے بستر پوری طرح کھولنے سے پہلے ہی ایسی لاینحل مشکلات کا سامنا ہوتا ہے کہ عافیت واپسی میں ہی نظر آتی ہے۔

"اردو ڈائجسٹ" کے شکریے کے ساتھ اس کے شمارۂ دسمبر ۸۶ء میں شائع شدہ ایک تحریر کا عکس بھی اس دفعہ 'میثاق' کا حصّہ ہے۔ اسے پڑھنا شروع کیا تو نظر کو آنسوؤں نے دھندلا دیا۔ چنانچہ حاضرین مجلس میں سے ایک صاحب کو پڑھنے کی زحمت دی) اس خاکسار راقم کے دل کی گہرائیوں سے یہ دعا نکلی کہ ربِّ کریم اُسے واقعتاً ایسا بنا بھی دے جیسا کہ وہ محترم مضمون نگار کو نظر آیا جن بزرگوں اور عزیزوں کے چہروں کو اس تحریر میں روشن قرار دیا گیا ہے ان کی ضیا پاشیوں کو اللہ تعالیٰ اور بڑھائے اپنا جو حال ہے وہ عرض کر ہی دیا۔

آخر میں ایک لطیفہ بھی ہو ہی جائے۔ ایک صاحب کا یہ ادّعا لاہور کے کثیر الاشاعت اخبار میں شائع ہوا کہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اُن سے سلسلۂ قادریہ میں بیعت ہو گئے ہیں۔ وغیرہ۔ خبر کا انداز خاصا "سنسنی خیز" تھا چنانچہ اس کی تردید اخبارات کو بھیجی گئی جسے بدقسمتی سے وہ نمایاں جگہ نہ ملی جو اصل 'خبر' کو دی گئی تھی چنانچہ اُسے یہاں نقل کیا جا رہا ہے تاکہ رفقائے تنظیم اسلامی اور دیگر احباب جو مجسّم سوال ہیں ان کی تشفی کا سامان ہو سکے۔

"امیرِ تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ میں اصولاً بیعتِ سلوک و ارشاد کا قائل ہوں لیکن عملاً میں نے کسی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ روزنامہ 'جنگ' لاہور میں قائد آباد کے نامہ نگار کے حوالے سے شائع شدہ ایک خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایسی خبریں تراشنا جن سے معاشرے کے مختلف طبقوں میں غلط فہمیاں پیدا ہوں کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ بلا تصدیق ہر طرح کی خبروں کو چھاپ دینا صحت مند صحافت کی علامت نہیں ہے۔ میں اسی شہر میں رہتا ہوں اور میرے پاس ٹیلیفون کی سہولت بھی موجود ہے۔ اگر اس خبر کی اشاعت سے پہلے مجھ سے تصدیق کر لی جاتی تو وہ سب لوگ جو میری ذات اور فکر سے دلچسپی

(باقی صـ۱۶ پر)

"سندھ کا مسئلہ" اور قارئین

ہم سندھ کے مسئلہ سے متعلق قارئین کے خطوط میں سے تین منتخب خطوط پیش کر رہے ہیں جن کے ذریعے سندھ میں موجود مختلف طرز فکر کے حامل تین طبقات کی نمائندگی ہو جاتی ہے۔ ان خطوط کا کسی قدر تعارف "عرض احوال" میں بھی شامل ہے

(۱)

جناب محترم ڈاکٹر اسرار احمد قبلہ صاحب

السلام علیکم: یہاں پر خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں۔ آپ کا سلسلۂ مضمون "سندھ کی صورت حال" کی تیسری قسط تک بہت غور سے پڑھی پہلی قسط پڑھتے وقت اتنا متوجہ نہیں ہوا تھا دوسری تیسری قسط پڑھنے کے بعد تو اچانک چوکنا ہو گیا ہوں، کاش ہمارے حزب اقتدار کو کچھ سمجھ آ جائے اور وہ سندھ کے موڈ کو سمجھے آپ نے ابتک جو کچھ لکھا ہے اور آئندہ لکھنے کا موڈ ہے وہ صحیح اور درست ہے اور ہوگا میری طرف سے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں آپ کا عقیدہ اور میرا عقیدہ تو مختلف ہو سکتے ہیں مگر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اور آپ ایک ہیں اور ہونا بھی چاہیئے۔ میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ آپ جس طرح سندھ کی صورت حال کا جائزہ پیش کر رہے ہیں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچایئے اس وقت میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ آپ سندھ اور سندھیوں پر احسان کر رہے ہیں اور ہمیں ۴۳ سال پرانا نعرہ یاد دلا رہے ہیں جو ہمارے جرنیل ہوش محمد شیدی نے لگایا تھا وہ نعرہ انگریز کے خلاف تھا کہ (مردیسون سندھ نہ ڈیسون) جیسا کہ وہ نعرہ ایک غیر مسلم کے خلاف اور غاصب کے خلاف تھا کسی مسلمان کے خلاف نہیں تھا مگر اب یہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ سندھ پر پھر فتح کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور سندھیوں کو وہی نعرہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ (مردیسون سندھ نہ ڈیسون) کیا حالیہ حکومت انگریزوں کی طرح ہماری سندھ پر حکومت کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ آپ کیا ہیں یہ مجھے پتہ نہیں۔ عالم ہیں۔ مدبر ہیں۔ صحافی ہیں سندھی ہیں پنجابی ہیں یا کچھ اور ہیں مگر اس وقت

ہمارے ترجمان اور سندھ کے وکیل ہیں اس کے ساتھ میں روزنامہ جنگ کراچی کا شکرگذار ہوں، جنہوں نے آپ کا مضمون شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اُمید ہے آپ کا جاری مضمون پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جو کہ موجودہ حکومت کے لئے ایک سبق ہے اُمید ہے موجودہ حکومت اس پر سنجیدگی سے غور کرے گی اور سندھیوں کے حقوق ان کو دلائے گی بلکہ واپس کرے گی اس وقت فوج واپس سندھ میں پہنچ گئی ہے پتہ نہیں کیا فتح کرنے آئی ہے اگر وہ سندھ کو فتح کرنے آئی ہے تو وہ اس کی بھول ہے اگر ہراساں کرنے آئی ہے تو وہ بھی اس کی بھول ہے سندھیوں کو وہ نعرہ یاد ہے بھی یاد ہے کہ (سر ویسوں سندھ نہ ڈیسوں) اور شاہ عبداللطیف کا وہ حکم بھی یاد ہے۔

سوره مرین سوپ کی پتہ دل جادھو وسار
ھٹ پالاوڑہ پاکرین آڈیے دال مر ذار
متاتیغ تڑا رمارته متاروتیٔـن ۔ شاہ

جناب عالی سندھ ایک اپنی خاص تاریخ رکھتی ہے یہ بزرگوں کی سرزمین ہے۔ یہ راجا ڈاہر یہ محمد بن قاسم۔ سمون۔ سومرہ۔ علہوڑا۔ تالپور قوم کی حکمرانی میں رہی ہے۔ کسی مغل افغان یا خلجی وغیرہ کے قبضہ میں نہیں رہی اس کی اپنی ایک الگ حیثیت ہے ایک قبضہ ہماری سندھ پر انگریزوں نے کیا دوسرا قبضہ ہم پر پاکستان بننے کے بعد ہوا ہے دوسرا قبضہ تو ہم نے مصلحتاً برداشت کیا کہ چلو مسلمان ہیں مگر انہوں نے تو ہمارے روزگار، تجارت، زمین ہر چیز ہم سے چھین لی ہماری ثقافت پر ڈاکہ ڈالا عریانی، فحاشی، ملاوٹ۔ چور بازاری چرس ے افیم، شراب، ہیروئن کے تحفے ہم کو دیئے۔ ڈاکٹر صاحب بتایئے ہم نے کون سا گناہ کیا ہے۔ آپ کو میں دعوت دیتا ہوں ہمارے دیہاتوں میں چلئے وہاں آپ کو اتنی سادگی نظر آئے گی کہ آپ حیران ہو جائیں ہمارے بوڑھے بزرگ تو دیسی گھی لسی مکھن اور سبزیوں کے علاوہ کوئی چیز پسند ہی نہیں کرتے پھر ہمیں ہیروئن، چرس کیوں دی جارہی ہے؟ ہماری زمینیں پنجابی فوجیوں کو کیوں دی گئی ہیں۔ آخر میں میں آپ سے ملاقات کا بہت شوق رکھتا ہوں اُمید ہے آپ اپنا پتہ اور ملاقات کا ٹائم اوپر دی ہوئی ایڈریس پر بھیج دیں گے۔

جناب عالی: اس وقت سندھ کی صورتحال پیار محبت سے جیو اور جینے دو کے اصول پر قابو میں آسکتی ہے مگر محبت کے بغیر اور سختی سے کچل دیں گے کے اصول پر عمل

کرنے سے اور قابو سے باہر ہو جائے گی۔

آپ کو یاد ہو گا کہ سندھو دیش کا نعرہ ۱۹۷۲ء میں جی ایم سید نے لگایا تھا اب اسی طرح کے کئی نعرے اور لگ رہے ہیں وہ کیوں لگ رہے ہیں ان کی وجہ کیا ہے اس کو کسی نے نہیں جاننا چاہا صرف یہ کہا کہ لگایا کیوں ان کی زبان کھینچ دو۔ ان کے ہاتھ توڑ دیئے جائیں گے کچل دیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ امید ہے آپ نے جو بیڑا اٹھایا ہے اس کو تکمیل تک پہنچائیں گے۔ آپ کا خیر اندیش

میر ہوت علی تالپور خیرپور میرس

(۲)

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب۔

السلام علیکم۔ مزاج گرامی۔

روزنامہ جنگ میں آپ کے سابقہ اور حالیہ سلسلہ ہائے مضامین پیشِ نظر ہیں۔ آپ کے جذبہ اور خلوص پر شک نہیں لیکن میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ نے سندھ کا حقیقی مسئلہ اور اس کا حل پیش نہیں کیا۔ سندھ کی حقیقی صورتحال کچھ یوں ہے کہ تقسیمِ ہند کے وقت سندھ کی ۴۵ لاکھ آبادی میں ۳۳ فی صد ہندو تھے۔ ہندوؤں کی اکثریت شہروں میں آباد تھی لیکن انتقالِ آبادی کے نتیجے میں سندھ کے تمام شہر جو پہلے ہندو شہر تھے، مہاجر شہر بن گئے۔ کراچی کی جس ۴ لاکھ آبادی میں ۸۰ فیصد ہندو تھے ۱۹۴۷ء کے بعد بڑھ کر ۸ لاکھ ہو گئی اور اسی طرح حیدرآباد کی ایک لاکھ آبادی جس میں ۸۰ فیصد ہندو تھے بڑھ کر تین لاکھ ہو گئی۔ فرق صرف اتنا ہوا کہ ہندو سندھی ان ہی کی زبان یعنی سندھی بولتا تھا۔ مہاجر اُردو بولتے ہیں۔ ان مہاجرین نے کراچی، حیدرآباد اور دیگر شہروں میں کارخانے اور تجارتی مرکز قائم کیے اور ان اداروں سے نہ صرف اپنا معاشی مسئلہ حل کیا بلکہ دیگر لوگوں کو بھی ذریعہ معاش فراہم کیا۔ آج صرف کراچی جس کی آبادی ۷۰ لاکھ ہے پنجاب اور سرحد اور دیگر علاقوں کے تقریباً ۲۵ لاکھ افراد ہیں۔

سندھ میں کیونکہ سندھی ہندو اپنے ساتھ سندھ کا کوئی حصہ نہیں لے گیا اس لیے سندھ میں ہندوستان کے اقلیتی صوبوں کے مسلمان مہاجر آئے جو سندھی کے بجائے اُردو یا کوئی دوسری زبان بولتے ہیں اس لیے یہاں لسانی مسئلہ ہے اور سندھی اور مہاجر کی تفریق ہی

ہے جو پہلے ہندو اور مسلمان کی تفریق تھی۔ چونکہ مہاجر ہندوؤں کی تعداد سے زیادہ آئے اس لیے یہ تفریق اور بھی واضح ہوگئی۔ اِس کے باوجود میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ کوئی سندھی خواہ وہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں ہی کیوں نہ رہتا ہو ایسا نہیں جو اُردو نہ سمجھتا یا بولتا ہو جبکہ پنجاب میں ذریعہ تعلیم شروع سے ہی بلکہ پاکستان بننے سے پہلے سے، ہی اُردو تھا۔ اس کے باوجود اُردو سندھ میں پنجاب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ پنجابی لکھتا تو اُردو میں ہے لیکن بولتا پنجابی میں ہے خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی کیوں نہ ہو۔ پنجاب میں کیونکہ ہندو اور سکھ پنجاب کا حصّہ بھی اپنی آبادی کے حساب سے لے گئے اور ان کی جگہ مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجر آئے جن کی زبان پنجابی تھی اس لیے وہاں لسانی مسئلہ پیدا نہیں ہوا حالانکہ وہاں بھی تفریق ہے۔ مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے پنجابی مہاجر جو کراچی اور لاہور میں آباد ہوئے وہ اپنے کو راولپنڈی کا کہتے ہیں اور جو راولپنڈی میں جاکر آباد ہوئے وہ خود کو لاہور کا بتلاتے ہیں۔ یہ اسی تعصب کی وجہ سے ہے جو مقامی پنجابی مہاجروں سے رکھتے ہیں خواہ وہ مشرقی پنجاب کے ہی کیوں نہ ہوں۔

سندھ میں موجودہ خلش ایک فطری بات ہے سندھیوں کو مہاجروں سے کوئی پُرخاش نہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ ہندو سندھی کی جگہ آئے ہیں اور انہیں کی جگہ جن شہروں میں ہندو آباد تھے یہ آباد ہوگئے۔ کراچی اور حیدرآباد وغیرہ میں کیونکہ آبادی کا تناسب فوراً ہی بدل گیا اس لیے مہاجروں کو سندھیوں میں ضم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا بلکہ ان شہروں میں کیونکہ مقامی سندھی مسلمان آٹے میں نمک کے برابر ہیں اس لیے وہ مہاجروں میں ضم ہوگئے۔ اسی طرح ان چھوٹی جگہوں پر جہاں مہاجر برائے نام ہیں وہ بھی سندھیوں میں ضم ہوگئے۔

سندھیوں کو پنجاب اور دیگر صوبوں کے لوگوں کے اِس وسیع پیمانے پر نقلِ مکانی پر تشویش ہے اور اب تو سندھیوں کی طرح مہاجر بھی پریشان ہیں کیونکہ روزگار کے مسائل، تشویشناک حد تک بڑھ گئے ہیں۔ صرف کراچی میں پنجاب اور سرحد کے ۲۰ سے ۲۵ لاکھ تک افراد آباد ہیں۔ سندھ کے اندر بھی وسیع پیمانے پر پنجابی آباد ہوگئے ہیں۔ اس سے مسائل پیدا ہوگئے ہیں اس کا ECONOMIC FACTOR تو ہے لیکن اس سے SOCIAL PROBLEMS بھی پیدا ہوگئے ہیں۔ سندھی ہو یا مہاجر دونوں کے لیے روزگار کی دشواریاں پیدا ہوگئی ہیں۔ کوٹہ سسٹم کی وجہ سے ۶۰٪ روزگار کے مواقع سندھ میں یا کراچی میں وفاقی ملازمتوں میں آکر پنجابی لے جاتے ہیں اور یہ دونوں دیکھتے رہ جاتے ہیں جبکہ پنجاب میں کوئی سندھی یا مہاجر اپنا کوٹہ حاصل کرنے نہیں جاتا۔ کم از کم گریڈ ایک سے پندرہ تک

کی اسامیاں صرف مقامی لوگوں سے پُر کرنی چاہئیں۔ کوٹہ سسٹم سکیل سولہ اور اس سے اُوپر کی اسامیوں کے لیے ہونا چاہیئے۔ یہ دوسرا سوال ہے کہ سندھی یا مہاجر پنجاب یا دوسری جگہ چھوٹی ملازمتیں حاصل کرنے کیوں نہیں جاتے۔ شاید یہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔ کہ ہر مرکزی کارپوریشن کا ہیڈ آفس اسلام آباد اُٹھا کر لے جایا جاتا ہے کہ اس طرح کراچی کے لوگ ملازمتیں چھوڑ دیں گے یا اگر اسلام آباد وغیرہ گئے بھی تو کراچی واپس جانے کی فکر کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بنک کا ہیڈ آفس بھی اسلام آباد منتقل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جو کچھ باقی رہ جاتے ہیں انہیں بھی اس طرح دھکا دے دیا جائے۔ ایوب خان نے اپنی مہاجر دشمنی اور پنجاب کو نوازنے کی وجہ سے دارالخلافہ بھی اسلام آباد منتقل کر دیا تھا۔ حالانکہ اس وقت مشرقی پاکستان کے تمام محبِ وطن لیڈروں نے اس کی مخالفت کی تھی اور سہروردی نے کہا تھا کہ اسے بذریعہ ریل لے جایا گیا ہے اگر بذریعہ ہوائی جہاز واپس نہ لایا گیا تو ملک کو یکجا رکھنا مشکل کیا ناممکن ہوگا۔ قائدِ اعظم کے طے شدہ دارالخلافہ کو بھی صرف نوکریوں کی خاطر تبدیل کر کے ملک کو دولخت کر دیا گیا اور اب بھی جب تک اسلام آباد موجود ہے ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔

ملازمتوں اور روزگار کے علاوہ سیاسی مسائل بھی پیدا ہو گئے ہیں۔ صوبہ سرحد کے لوگ قبائلی طرز پر رہتے ہیں۔ سمگلروں کی اکثریت جو چرس وغیرہ اسمگل کرتی ہے وہ انہی لوگوں پر مشتمل ہے۔ اب بعض علاقے تو ان کی CONSTITUENCY بن گئے ہیں۔ جہاں سے وہ اپنے ممبران قومی و صوبائی اسمبلی اور مقامی نمائندے بھی چُن لیتے ہیں۔ اسی طرح آزاد علاقے بھی قائم کر لیے ہیں۔ مہاجر اور سندھی دونوں اس صورتِ حال سے نہ صرف پریشان بلکہ بد دل بھی ہو گئے ہیں۔ مہاجر قومی موومنٹ کے جلوس پر حملہ ایک سازش کے تحت کر کے ان کا رُخ اپنے مسائل سے ہٹا کر فروعی معاملات میں اُلجھانا ہے۔ مہاجر یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ یہاں پولیس، مرکزی و صوبائی محکموں اور PUBLIC SECTOR انڈسٹریز میں دوسری جگہ کے لوگ کیوں اس طرح بھرتی کر لیے گئے ہیں جنہیں یہاں کے لوگوں سے کوئی ہمدردی تو درکنار بلکہ وہ تو خود یہ کہتے ہیں کہ ہم تو یہاں مال کمانے آئے ہیں۔ یہ صورتِ حال کسی دوسری جگہ موجود نہیں۔ فوج اور دیگر اداروں کا بھی یہی حال ہے۔ P.I.A تو پنجاب ایئر لائنز کہلانے لگی ہے۔ اس وجہ سے یہاں کے مقامی تعلیم یافتہ طبقہ میں خواہ وہ مہاجر ہو یا اندرون سندھ رہنے والا سندھی مایوسی کا ہونا فطری بات ہے اور موجودہ صورتِ حال اس کا ردِ عمل ہے۔

مسئلہ کا حل

سندھ کی سطح تک اس کا حل یہ ہے کہ کیونکہ سندھ دو لسانی صوبہ ہے اور واضح تفریق ہے جو پاکستان بننے سے پہلے ہندو اور مسلمان

سندھی کی شکل میں تھی اور اب مہاجر اور سندھی کی شکل میں ہے اس لیے اسے دو انتظامی حصوں (REGIONS) میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک کا صدر مقام کراچی۔ جس میں کراچی اور حیدر آباد شامل ہوں۔ اور دوسرے کا صدر مقام سکھر جس میں سکھر اور لاڑکانہ شامل ہوں۔ یعنی ایک علاقہ کراچی سے ٹنڈو آدم تک اور دوسرا ٹنڈو آدم سے ماچھی گوٹھ تک۔ جس کا صدر مقام سکھر ہو۔ جو سندھ کے پرانے دارالخلافے کے قریب ہے سکھر کو اس طرح ترقی دی جائے کہ وہ ہر طرح ایک شایانِ شان دارالخلافہ بن سکے۔ کوشش کی جائے کہ اس ریجن میں سندھی زیادہ سے زیادہ آباد ہوں تاکہ زبان اور کلچر کا مسئلہ نہ ہو۔ مرکزی اور صوبائی ملازمتوں میں اور PUBLIC SECTOR INDUSTRIES میں صرف اسی علاقہ کے لوگوں کو رکھا جائے۔

ہندوستان نے بھی اپنے لسانی اور علاقائی مسائل کا حل اسی طرح کیا ہے اور آج مشرقی پنجاب کو ۳ حصوں میں تقسیم کرنے سے یہ فائدہ ہوا کہ سکھوں کی شورش صرف ایک حصے تک محدود ہے۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی اسی طرح کی انتظامی تقسیم کی گئی جس کے مثبت نتائج نکلے۔ پاکستان کو بھی اپنے انتظامی حالات اور دیگر مسائل کو حل کرنے کے لیے صوبوں کی از سرِ نو موجودہ حالات میں ترتیب دینا چاہیئے۔ تاکہ نہ صرف انتظامی حالات بہتر ہو سکیں بلکہ سیاسی مسائل کو بھی حل کیا جا سکے۔

یونیورسٹیوں کا شہر سے باہر لے جانا اور ہوسٹلوں کا قیام طلبہ میں جرائم اور شورش کا باعث ہے۔ خاص طور پر سندھ یونیورسٹی جب سے شہر سے باہر بنائی گئی ہے وہ تعلیم گاہ کے بجائے غنڈہ گردی اور بدنظمی کا مرکز بن گئی ہے۔ میرے خیال میں موجودہ جگہ سندھ یونیورسٹی کو تبدیل کر کے ایک اقامتی درسگاہ (RESIDENTIAL UNIVERSITY) بنائی جائے جہاں حقیقی طلباء کو اقامتی درسگاہ میں تعلیم دی جائے۔ اس میں ملک کے تمام علاقوں کے لوگوں کو داخلہ دیا جا سکتا ہے اور اس کا خرچ اور انتظام مرکزی حکومت کرے۔ اس طرح ملک کو علی گڑھ کے طرز پر پہلی اقامتی درسگاہ بھی مل جائے گی۔ اور موجودہ گڑبڑ سے بھی نجات ہو جائے گی۔ حیدر آباد کی ضروریات کے لیے سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس میں ایک نئی یونیورسٹی بنائی جائے جو حیدر آباد کے طلباء کی تعلیمی ضروریات کو پوری کرے۔ اسی طرح سکھر میں ایک نئی یونیورسٹی بنائی جائے جو شہر میں ہو اور وہاں کی ضروریات پوری کر سکے۔ طلباء میں ڈسپلن پیدا کرنے کے لیے انہیں لازمی فوجی تربیت بھی دی جائے تاکہ وہ بہتر شہری بن سکیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر فوری طور پر مثبت اقدام نہ اٹھائے گئے تو ہمارے دشمن اس سے پورا فائدہ اٹھائیں گے۔ پیشتر اس کے کہ ہمارے دشمن ہماری کوتاہیوں سے سیاسی فائدے حاصل کر پائیں، ہمیں اپنے معاملات بہتر اور معقول طور پر حل کر لینا چاہئیں۔

مرسلہ: حسن ... سید صدیقی، کراچی

(۳)

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اُمید ہے کہ آپ کی طبیعت اچھی ہوگی دُعا گو ہوں کہ اللہ تعالےٰ آپ کو صحت یاب رکھے (آمین) میں دیر سے تعزیت کر رہا ہوں دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دونوں عزیزوں کو جو اللہ کے سپاہی تھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے دونوں کے گناہوں کو معاف فرما دے اور اُن کے درجات کو بلند فرما دے (آمین)

دیر سے تعزیت کی وجہ کراچی کے نسلی فسادات ہیں۔ توحید کالونی میں پٹھانوں نے روسی ہتھیاروں سے حملہ کیا اسمیں میرا گھر بھی تباہ ہوگیا۔ میرا پڑوسی ڈنڈا لے کر نکلا۔ اُس کی ہمت کا جواب نہیں۔ مگر گولیوں نے اس کو موت کی آغوش میں پہنچا دیا۔ چار لڑکے ہیں سب سے بڑے لڑکے کی عمر ۵ سال کی ہے۔ اس نے مجھکو دیکھتے ہوئے دور سے کہا "نانا ابو نہیں آئے"، "ابو نہیں آئے" میں آگیا ہوں بیٹا میں نے گود میں اٹھا کر پیار کیا۔ تین دنوں سے زمین پر سونے کی وجہ سے بخار اور کھانسی بھی ہوگئی ہے بڑی مشکل سے انٹی بیوٹک دوائے کر آیا ہوں۔ رات جب سب سو گئے تو میں اپنے گھر کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ بڑی مشکل سے بنا تھا۔ کراچی میں مزدور کی زندگی ایک سخت ترین زندگی ہوتی ہے۔ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے بار بار گھر نہیں بنا سکتے ابھی میں خیالوں کی دُنیا میں گم تھا کہ یکایک آواز آئی "بیٹا"، گھر پر آنسو بہا رہے ہو پلٹ کر دیکھا تو ایک بڑی بی تھیں۔ بولیں یہاں تو پوری زندگی قربانیوں میں ختم ہو رہی ہے ہندوستان میں ایک اُمید پر قربانی دی تھی، پھر بنگال میں مال وجان کی قربانی دینی پڑی، اتنی قربانیوں کے باوجود سکون حاصل نہ ہوا۔ میرا نواسہ اور پوتا دونوں گولیوں کا شکار ہو گئے۔ پتہ نہیں اللہ تعالےٰ کو کیا منظور ہے میرے سامنے سارا خاندان ایک ایک کر کے اسلام اور پاکستان پر قربان ہوگیا مگر . . . . میں رہ گئی ہوں صرف ماتم کرنے کیلئے۔ اب تو آنکھوں میں آنسوں تک نہیں۔ "بیٹا تمہارا صرف گھر قربان ہوگیا ہے"۔ یہاں تو ہر دور میں قربانی دینی پڑی، پاکستان یوں تو اسلام کے لئے بنا تھا مگر اسلام تو خیر قیامت کے بعد ہی آئے گا ابھی تو پاکستان قربانیوں کا قبرستان ہے۔ بڑی بی اتنا کہہ کر لاٹھی ٹیکتی ٹیکتی گزر گئیں۔ میں کچھ بھی جواب نہ دے سکا۔

تاریخ اسلام اور احادیث میں مہاجر اور انصار کی داستان بیان ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب صرف سنانے کے لئے ہمارے اصحاب ایسے تھے اور ایسے تھے مگر جب عمل کا وقت آتا ہے تو سب کچھ احادیث اور تاریخ اسلام کے خلاف نظر آتا ہے نسلی امتیازات اس کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

اور یہ نسلی فسادات بھی۔ ایک طرف چار قوموں کے درمیاں مہاجر جو ہندوستان کے مختلف شہروں سے آئے ہیں ۴۰ سال بعد بھی مہاجر کہلاتے ہیں۔

ایک طرف عربوں کو دیکھتے ہیں کہ عرب قومیت کے ہوتے ہوتے بھی انہوں نے مہاجروں کو بنایا نہیں۔ کبھی یہودیوں نے قتل عام کرتے ہیں، کبھی عیسائیوں موت کے گھاٹ اتارتے ہیں اور آج شیعہ عمل ملیشیا پوری طرح صفایا کر رہی ہے۔ ایک ہی زبان ایک ہی تہذیب و تمدن ایک ہی خطہ مگر عرب میں بھی عربی مہاجر کو سکون نہیں ملا۔

یہاں تو بہت مشکل ہے زبان اردو نہیں تہذیب و تمدن ہندوستانی نہیں، نسل بھی علیحدہ ہے۔ ہاں! ایک صرف ہندوستانی اسلام ہے۔ جس کی بنا پر دونوں میں اتحاد ہو سکتا ہے۔ مگر بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور شیعہ کی تقسیم جو دنیا کے کسی اور مقام پر نہیں وہ ہندوستانی اسلام کا لازمی حصہ ہے۔

وہ اسلام جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا اب نہیں ہے۔ نماز ہی کو لیجئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز آج دنیائے اسلام میں کہیں نہیں ہے۔ ۲۳ سال تک نماز ادا کرتے رہے پھر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز ہے نہیں۔ ہاں! حج جو اپنی زندگی میں صرف ایک بار کیا۔ وہ موجود ہے اپنی اصلی حالت میں ہندوستانی اسلام میں بھی کوئی انصاف نہیں ہے۔

اچھا اب اجازت دیجئے۔ والسلام آئی آئی۔ کا کا سائٹ کراچی۔ ۱۶

بقیہ: 'عرض احوال'

رکھتے ہیں پریشانی میں مبتلا نہ ہوتے۔ انہوں نے کہا کہ اسلام تو انفرادی سطح پر بھی سُنی سنائی بات کو بلا تصدیق آگے بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتا چہ جائیکہ اخبار جیسے مؤثر ذریعہ ابلاغ کے ذریعے یہ کام کیا جائے انہوں نے صحافی برادری سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔ اگر اس دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے تو مرنے کے بعد ہر شخص کو اپنے قول اور فعل کا حساب دینا ہے۔"

ضمیمہ

استحکامِ پاکستان

سندھ کا مسئلہ

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اکبر

اسرار احمد

تمہید

✪

قدیم سندھی مسلمانوں کی عمومی بے چینی کے عناصرِ ثلاثہ

✱

مہاجرین کا ردِّ عمل

☆

جنرل محمد ضیاء الحق کا دورِ حکومت اور موجودہ صورتِ حال

تمہید

فلسفۂ وجود (جس کی ایک تعبیر ہمہ اوست ہے، دوسری وحدت الوجود اور تیسری وحدت الشہود) کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں کی جانب حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اپنے ایک فلسفیانہ اور عارفانہ شعر میں یوں اشارہ کیا ہے کہ ؎

"جہاں ہستی ہوئی محدود' لاکھوں پیچ پڑتے ہیں — عقیدے' عقل' فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں"

تو واقعہ یہ ہے کہ دولت خداداد پاکستان کے صوبۂ سندھ کی سرزمین اس وقت قسم قسم کے تصادم رنگا رنگ شکایتوں اور طرح طرح کی محرومیوں کے احساس کی بناء پر اس شعر کے مصرع ثانی کی منہ بولتی تصویر بن گئی ہے ــــ اس لئے کہ اوّل تو نسلوں اور زبانوں اور ان پر مبنی "قومیتوں" کی جتنی کھچڑی سندھ میں تیار ہوئی ہے ایسا معجون مرکب کم ازکم پاکستان کے کسی اور حصے میں موجود نہیں ہے ــــ پھر کراچی میں صنعت و تجارت کے ارتکاز اور انتہائی برق رفتاری سے بڑھنے والی آبادی نے جن پیچیدہ مسائل کو جنم دیا ہے ان کی شدت کی بھی کوئی دوسری مثال پاکستان کے کسی دوسرے مقام یا علاقے میں نظر نہیں آتی ــــ بنابریں اس وقت سندھ کا کوئی ایک سادہ مسئلہ نہیں ہے بلکہ بے شمار مسائل کا ایک طویل اور پیچیدہ سلسلہ ہے' اور یہاں کسی ایک ہی طبقے میں احساس محرومی نہیں پایا جاتا بلکہ مختلف گروہوں اور طبقوں میں مختلف قسم کی محرومیوں کا احساس موجود ہے' اور اُن کی بناء پر پیدا ہونے والے گلے شکوے بلکہ ان سے بھی بڑھ کر نفرتیں اور عداوتیں باہم اتنی گڈمڈ ہو گئی ہیں کہ بسا اوقات انسان کو خود بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کسی خاص موقع پر وہ کونسے احساسِ محرومی کے باعث ردّ عمل کا شکار ہو رہا ہے اور اس کی نفرت وعداوت اور غیظ وغضب کا اصل سبب کون ہے اور ان کا اظہار وہ کس کے خلاف کر رہا ہے ــــ چنانچہ اسی مرکب اور پیچ در پیچ احساسِ محرومی کے باعث سندھ میں وقتاً فوقتاً آتش فشاں کے پھٹنے کی سی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے دوران اچھے بھلے انسان ہسٹریا کی سی کیفیت میں مبتلا نظر آتے ہیں !

دوسری طرف' جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے' سندھ اس وقت نہ صرف

پاکستان ملکہ اس پورے علاقے ہیں خود اسلام کے مستقبل کے ضمن میں جسم کے نازک حصّے (SOFT UNDER-BELLY) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ___ لہٰذا اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ اس کے مسائل کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا جائے اور امکانی حد تک معروضی اور غیر جانبدارانہ انداز میں جائزہ لیا جائے کہ سندھ کے مختلف طبقات کو کیا کیا شکایتیں ہیں، اور کون کون سے اندیشے لاحق ہیں، مزید یہ کہ اُن کا کتنا حصّہ حقیقی اور واقعی ہے، کتنا اضافہ انسان کی اس طبعی کمزوری کا مظہر ہے کہ ع " بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیبِ داستاں کے لئے!" اور کتنا ملک و ملت کے دشمنوں کی ریشہ کاری اور "ایجادِ بندہ" کا نتیجہ ہے جس کی نہ کوئی اصل ہے نہ اساس! ___ پھر غور کرنا چاہیئے کہ حقیقی اور واقعی شکایات کے مستقل ازالے کی صورت کیا ہے اور فوری طور پر ان کی شدت میں کمی پیدا کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں۔

اس طرح کیا عجب کہ سندھ کے مسائل کا یہ تجزیاتی مطالعہ پورے پاکستان کے مسائل کی پہچان کا ذریعہ بن جائے اور ع " روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب" کے مصداق اس وقت سندھ جس بحرانی کیفیت سے دوچار ہے اور جس اضطراب اور کرب میں مبتلا ہے کیا عجب کہ وہ کسی نئے عہدِ سعادت کی ولادت کے درد کی لہریں (BIRTH PANGS) ثابت ہوں اور اللہ تعالےٰ شر سے خیر برآمد فرما دے، اس لئے کہ اس کی شان یہ ہے کہ :

" يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا " (سورہ روم : آیت ۱۹)

"وہ نکال لاتا ہے مُردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مُردہ کو اور زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مُردہ ہو جانے کے بعد"

لہٰذا اس کی قدرت سے کچھ بعید نہیں ہے اگرچہ بقول علاّمہ اقبال ع " رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!"

اس تجزیئے میں چونکہ مختلف طبقات کی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ذکر بھی لامحالہ آئے گا، لہٰذا اندیشہ ہے کہ ع " اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش!" کے مصداق راقم کے خلاف سب ہی کی جانب سے برہمی اور خفگی کا اظہار ہو، اس لئے کہ فی زمانہ ہر شخص اور ہر گروہ سارا الزام دوسروں ہی پر ڈال دینے کا عادی ہو چکا ہے اور کوئی بھی خود اپنے دامن کے داغ اور دھبے

دیکھنے پر آمادہ نہیں ہوتا ـــــ چنانچہ حال ہی میں راقم کو اس کا ایک تلخ تجربہ ہو بھی چکا ہے کہ خود احتسابی (SELF CRITICISM) کی ایک ذرا سی دعوت پر ایک گروہ اس درجہ ناراض ہوا کہ، اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین سے قطع نظر کہ اُن میں تو ظاہر ہے کہ تہذیب و شائستگی کا دامن ہاتھ سے بالکلیہ چھوڑ دینا ممکن نہیں ہوتا، نجی خطوط میں غلیظ گالیوں تک کی نوبت آگئی ـــــ لیکن راقم الحروف کے پیش نظر الحمدللہ کہ حسب ذیل قرآنی ہدایات ہیں:

"وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى" (سورۂ انعام: آیت ۱۵۲)

ترجمہ "اور جب بھی بات کرو انصاف ہی کی کرو خواہ کوئی تمہارا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو!"

"كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ"
(سورۂ نساء: آیت ۱۳۵)

ترجمہ "عدل و انصاف کے علمبردار اور اللہ کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ خواہ وہ خود تمہارے اپنے یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں ہی کے خلاف ہو!"

"كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى"
(سورۂ مائدہ: آیت ۸)

ترجمہ "اللہ کے علمبردار اور عدل و انصاف کے گواہ بن کر کھڑے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہ کرے۔ (ہر حال میں) انصاف کرو، یہی تقویٰ کے شایان شان ہے!"

لہٰذا اس تجزیئے میں راقم الحروف اپنے امکان بھر تو حق و انصاف ہی کی بات کرنے کی کوشش کرے گا ـــ تاہم وہ اس کا ہرگز مدعی نہیں ہے کہ اس کی ہر رائے حرفِ آخر ہے اس لئے کہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص معاملے میں اس کے مشاہدات محدود اور معلومات ناقص ہوں۔ یا نتیجہ اخذ کرنے میں غلطی ہو جائے۔ لہٰذا کسی بھی جانب سے ایسی کسی بھی نشاندہی پر راقم ان شاء اللہ العزیز ممنون و مشکور بھی ہوگا اور اُس پر کھلے دل و دماغ کے ساتھ غور کرنے کی کوشش بھی کرے گا۔ اس لئے کہ راقم کے نزدیک ملک و ملت کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ قومی و ملی مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور بھی کیا جائے اور اپنی آراء کا بلا جھجک اظہار بھی کیا جائے اور پھر دوسروں کی آراء پر بھی کھلے دل

کے ساتھ غور کیا جائے۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو حق کہنے، حق سننے، حق کو پہچاننے اور حق کو قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے: اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ۔ اٰمِیْن!

قدیم سندھی مسلمانوں کی عمومی بے چینی

کے عناصرِ ثلاثہ

ذرا بنظرِ غائر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ سندھ کے دوسرے طبقوں اور گروہوں جیسے اردو بولنے والے مہاجروں، پنجابی آبادکاروں اور پٹھان محنت کاروں کے گوناگوں مسائل سے قطعِ نظر، خود قدیم سندھیوں کا احساسِ محرومی بھی کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں ہے بلکہ بہت سی مختلف النوع محرومیوں اور بے چینیوں کا معجونِ مرکب ہے جو کئی تہوں اور متعدد سطحوں پر مشتمل ہے ـــــ چنانچہ اس کی سب سے زیریں سطح پر تو وہ بے چینی اور اضطراب پایا جاتا ہے جس کے اسباب کسی ایک صوبے یا علاقے تک محدود نہیں ہیں بلکہ ملک گیر ہیں، اگرچہ ان کے نتائج اور اثرات کو بعض ثانوی اسباب کی بنا پر محسوس سب سے بڑھ کر سندھ میں کیا گیا ہے۔ پھر اس کے اوپر کئی اضافی سطحیں ہیں جن کا تعلق سندھ کے خاص حالات سے ہے اور جنہوں نے صورتِ حال کو بے حد پیچیدہ اور سنگین بنا دیا ہے۔

۱۔ ملک گیر سیاسی محرومی اور معاشی استحصال

سندھ کی عمومی بے چینی اور عوامی اضطراب کا سب سے گہرا اور بنیادی سبب وہ ظالمانہ اور استحصالی سیاسی و معاشی نظام ہے جو پورے ملک پر مسلط ہے اور جس کے نتیجے میں پوری پاکستانی قوم شدید قسم کی اُفقی تقسیم اور محاذ آرائی (HORIZONTAL POLARISATION) کا شکار ہو گئی ہے۔ چنانچہ ظالم و مظلوم، قاہر و مقہور اور جابر و مجبور کی تقسیم بھی نمایاں نظر آتی ہے اور

'مستکبرین' (ARISTOCRATES) اور 'مستضعفین' (OPRESSED) کے علاوہ 'مستحصلین' (EXPLOITERS) اور 'مستحصَلین' (EXPLOITED) کے مستقل طبقات بھی وجود میں آ چکے ہیں۔ چنانچہ اس کا ردِّ عمل بھی کم و بیش تو پورے ملک اور اس کے چاروں صوبوں میں موجود ہے۔ لیکن بوجوہ اس کی شدت اور تلخی سب سے زیادہ صوبۂ سندھ میں محسوس کی جا رہی ہے۔

اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اوّلاً ——— خود سلطنتِ مغلیہ کی اساس ازمنۂ وسطیٰ کے اس ظالمانہ جاگیرداری نظام پر قائم تھی جو پوری دنیا میں صدیوں سے رائج چلا آ رہا تھا۔ پھر جب وہ کمزور پڑ گئی اور برِّعظیم پاک و ہند کے طول و عرض میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قدیم قانون مزید گھناؤنی صورت میں نافذ ہو گیا اور ہر جگہ جتھے داروں اور قبائلی سرداروں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں ——— اس کے بعد انگریز کا دور آیا تو اس نے کمالِ حکمتِ عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی نظام کو اپنے جبر و استحصال کا ذریعہ اور آلہ بنا لیا۔ اور اپنے اور مقامی جاگیرداروں اور وڈیروں کے مابین رابطے کے لئے ایک مضبوط اور مستحکم سول سروس قائم کی جو اکثر و بیشتر ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو رنگ اور شکل و صورت کے اعتبار سے تو ہندوستانی تھے لیکن ذہن و فکر اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے خالص انگریز بن گئے تھے۔

بعد ازاں جب ملک آزاد ہوا تو بھارت میں تو حکومت ایک ایسی سیاسی جماعت کے ہاتھ میں آئی جس کے پاس مخلص کارکنوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور ایسے لیڈروں کی بھی کمی نہ تھی جو ایک طویل عوامی جدوجہد کے دوران ایثار اور قربانی کی شاندار مثالیں اور اپنے خلوص و اخلاص کے بے شمار ثبوت پیش کر چکے تھے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی تنظیم کا ڈھانچہ دیہات اور قصبات سے لے کر کُل ہند سطح تک قائم تھا۔ اور اس کے کارکنوں کی صفیں بھی مرتّب و منظّم تھیں اور عہدوں اور منصبوں کا نظام بھی معیّن و مستحکم تھا ——— مزید برآں اس جماعت نے حکومت ہاتھ میں لیتے ہی دیسی ریاستوں کا بھی خاتمہ کر دیا اور سابق برٹش انڈیا میں قائم جاگیرداری اور زمینداری نظام کو بھی ختم کر دیا ——— نتیجۃً وہاں کم از کم سیاسی آزادی براہِ راست عوام تک پہنچ گئی اور حکومت بنانے یا بدلنے کا اختیار بالکلیہ

اُن ہی کے ہاتھوں میں آگیا۔

اس کے برعکس ـــــ پاکستان بھی اگرچہ قائم تو عوامی جدّوجہد اور عوامی رائے (VOTE) کے نتیجے میں ہوا تھا لیکن چونکہ مسلم لیگ کی حیثیت اصلاً ایک تحریک (MOVEMENT) کی تھی نہ کہ جماعت (PARTY) کی، اور جیسا کہ تحریکوں کا خاصّہ ہے، اس کی کُل جدّوجہد ایک شخص یعنی قائدِ اعظم محمد علی جناح کی 'معجزانہ' اور کرشماتی شخصیت (دیکھئے 'استحکامِ پاکستان' کا بابِ ہفتم ۱) کی مرہونِ منّت تھی اور بدقسمتی سے اُن کا انتقال قیامِ پاکستان کے تقریباً فوراً ہی بعد ہو گیا ـــــ لہٰذا یہاں آزادی کے ثمرات اور حکومت کے اختیارات کسی مضبوط اور مستحکم سیاسی جماعت کی وساطت سے عوام تک پہنچے ہی نہیں پائے بلکہ انہیں نوابوں اور جاگیرداروں، میروں اور پیروں، اور زمینداروں اور روڈیروں نے بیچ ہی میں اُچک لیا ـــــ لیکن پھر چونکہ خود اِن کے مابین نہ کسی سیاسی نظریئے اور فلسفے کا رشتہ موجود تھا، نہ باہمی معاملے کے کوئی اصول طے تھے، نہ افہام و تفہیم کے کوئی خطوط ہی معیّن تھے، لہٰذا اِن کی باہمی بندر بانٹ اور چھینا جھپٹی سے وہ افراتفری پیدا ہوئی کہ الامان والحفیظ!! ـــــ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر سول سروس نے خوب پَر پُرزے نکالے اور بیوروکریسی نے اپنے اختیارات کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور خود سنبھال لی ـــــ اور اس کے بھی کچھ ہی دن بعد قوّت ہی برحق ہے" (MIGHT IS RIGHT) کا اصول مزید عریاں انداز میں سامنے آیا اور زمامِ اقتدار قوم کے سب سے طاقت ور اور منظّم ادارے یعنی فوج نے سنبھال لی۔ گویا ؎

"وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۔۔۔ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!"

یعنی جب حکومت کا اختیار اس کے اصل حقداروں یعنی عوام سے چھیننا ہی ٹھہرا تو پھر یہ سول سروس کے نرم و نازک ہاتھوں میں کیوں رہے؟ اور کیوں نہ فوج کے تندرست و توانا ہاتھ اس کے مالک بن جائیں؟!

وہ دن اور آج کا دن، پاکستان میں اصل قوّت و اقتدار تو فوج کے ہاتھ میں ہے اور اس کے مستقل نائب و مددگار اور وزیر و مشیر کی حیثیت سول سروس کو حاصل ہے۔ البتہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ فوجی حکمران وقتی مصالح

کے تحت' اور بالخصوص عوام کے تیور بدلتے دیکھ کر عارضی طور پر زمینداروں
اور وڈیروں کو بھی اقتدار و اختیار میں کسی قدر حصہ دار بنا لیتے ہیں اور اس
طرح 'بحالیٔ جمہوریت' کا ڈھونگ رچاتے رہتے ہیں ـــــ!!!

چنانچہ مختلف ادوار میں حکومت کی ظاہری شکل و صورت بھی کسی قدر بدلتی رہتی ہے اور اس کے متذکرہ بالا اجزائے ترکیبی کی باہمی نسبت و تناسب میں بھی کچھ فرق واقع ہوتا رہتا ہے ـــ لیکن بہرصورت اصل 'دولتِ اقتدار' بالکل "دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ" کی سی شان کے ساتھ ان تین طبقوں ہی کے مابین گردش کرتی رہتی ہے۔ (سورۂ حشر: آیت ۷: "تاکہ نہ رہے وہ گردش میں تمہارے اُمراء ہی کے مابین!") اور ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال کم از کم بیسویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی جبکہ عرصہ ہوا کہ علامہ اقبالؔ کے بقول ابلیسِ لعین نے بھی عوامی بیداری کے پیشِ نظر ملوکیتِ مطلقہ کو عوامی جمہوریت کا لباس پہنا دیا ہے ؎

"ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس   جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!"

چنانچہ پوری پاکستانی قوم کے تحت الشعور میں ایک بے چینی اور احساسِ محرومی سرایت کئے ہوئے ہے اگرچہ بعض اسباب کی بنا پر، جن کا ذکر ابھی ہو گا، اس کا احساس و شعور سب سے بڑھ کر سندھ کے قدیم باسیوں کو ہوا!

فوج، سول سروس اور 'خداوندانِ زمین'[1] (LAND LORDS) کے ساتھ ساتھ 'سرمایہ داروں' کا ایک چوتھا طبقہ بھی پاکستان میں نہایت تیزی کے ساتھ پروان چڑھا جس نے سیاسی جبر و استبداد پر معاشی استحصال کا 'بالاخانہ' تعمیر کیا اور اس طرح متذکرہ بالا افقی تقسیم اور محاذ آرائی کو مزید گہرا اور نمایاں کر دیا ـــــ اس طبقے کے بارے میں یہ اہم حقیقت لائقِ توجہ ہے کہ چند قدیم کاروباری خاندانوں اور تجارت پیشہ برادریوں کے سوا (جیسے گجرات کے میمن، بمبئی کے خوجے اور بوہرے، دہلی اور یوپی کی 'پنجابی سوداگر برادری' اور پنجاب کی قدیم شیخ برادریاں) پاکستان کے 'نودولتیے' طبقے کی عظیم اکثریت اسی 'اتحادِ ثلاثہ' کی کوکھ سے برآمد بھی ہوئی ہے اور اسی کی جائز و ناجائز سرپرستی سے پروان بھی چڑھی ہے ـــــ چنانچہ ایک

---

[1] ؎ دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں   تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں، میری نہیں! اقبالؔ

طرف پاکستان کے اکثر و بیشتر بڑے زمیں دار اب بڑے کارخانہ دار بھی بن گئے ہیں اور دوسری طرف فوجی جرنیلوں کی اکثریت بھی نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً بھی زمیندار اور کارخانہ دار بن گئی ہے، حالانکہ ان کی غالب اکثریت نے انگریزی فوج کے حوالداروں اور صوبیداروں یا ادنیٰ اور متوسط طبقے کے سول ملازمین کے گھروں میں آنکھ کھولی تھی، بلکہ 'فوجی فاؤنڈیشن' کو اب غالباً ملک کے سب سے بڑے صنعتی ادارے کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے ـــــ رہی سول سروس تو وہ بھی اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے میں کسی سے پیچھے نہیں رہی، اگرچہ اس کی اکثریت نے صرف جائدادوں اور سرکاری تمسکات اور صنعتی حصص کی صورت میں 'سرمایہ کاری' ہی پر قناعت اور اکتفا کی ہے!

الغرض، یہ ہے اُس سیاسی و معاشی ناانصافی اور عمومی ظلم و استحصال اور اس سے پیدا شدہ احساسِ محرومی کا پس منظر، جو اگرچہ فی نفسہٖ تو ملک گیر ہے لیکن اس کا ردِ عمل پاکستان کے مختلف علاقوں میں کم و بیش شدّت کے ساتھ ظاہر ہوا ہے ـــــ تو آئیے کہ اب ایک نظر عمومی ظلم و استحصال کے خلاف ردِ عمل کی شدّت کی اس کمی اور بیشی کے اسباب پر ڈال لیں۔

اس ملک گیر سیاسی ظلم اور معاشی استحصال کے شعور و احساس اور ان کے خلاف ردِ عمل کے ظہور کے ضمن میں ایک فرق تو یہ ہے کہ اس کی شدّت پاکستان کے شمالی صوبوں یعنی پنجاب اور سرحد کے مقابلے میں جنوبی صوبوں یعنی سندھ اور بلوچستان میں نمایاں طور پر زیادہ نظر آتی ہے ـــــ اور دوسرا فرق یہ ہے کہ جنوبی صوبوں میں سے بلوچستان میں اس کا ظہور مختلف انداز سے ہوا اور سندھ میں مختلف صورت میں!

ان میں سے مقدم الذکر فرق و تفاوت کی ایک وجہ قدیم تاریخ سے متعلق ہے اور اس کا ایک دوسرا سبب ماضی قریب کی تاریخ کے ایک اہم واقعہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ سے ادنیٰ واقفیت رکھنے والا شخص بھی جانتا ہے کہ پنجاب اور سرحد اور بالخصوص ان کے وسطی علاقے قدیم زمانے سے حملہ آوروں اور فاتحوں کی گذرگاہ رہے ہیں ـــــ چنانچہ اس علاقے میں کوئی اہم اور قابلِ ذکر مقامی حکومت کبھی زیادہ دیر قائم نہیں رہ

سکی ، یہی وجہ ہے کہ تین صدی قبل کے راجہ پورس کے بعد پھر انیسویں صدی عیسوی کے مہاراجہ رنجیت سنگھ ہی کا نام ملتا ہے ! علاوہ ازیں ، اس علاقے میں کوئی مضبوط مقامی نیشنلزم بھی جڑیں نہیں پکڑ سکا بلکہ اس کے برعکس یہاں کے لوگوں میں " گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں ،، کے مصداق نت نئے فاتحین کے ساتھ معاملہ کرنے اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پیدا ہوگئی — چنانچہ سکھوں کے عروج و زوال کی تاریخ کے یہ دو نکتے بہت قابلِ توجہ ہیں کہ ایک طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ کے سیاسی عروج کا آغاز ہی ابدالی کی توپوں کو دریا پار کرا دینے کی خدمت کے معاوضے کا رہونِ منت ہے — اور دوسری طرف اس کے باوجود کہ انگریزوں نے حکومت سکھوں سے چھینی تھی ، سکھوں کو فوراً ہی انگریز کے ساتھ سازگاری اختیار کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی — حتیٰ کہ انہوں نے انگریز کی فوج میں بھرتی ہوکر " کارہائے نمایاں " سرانجام دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی !

اس کے برعکس سندھ اور بلوچستان تاریخ کے دوران زیادہ تر الگ تھلگ رہے اور وہاں بیرونی فاتحین کا عمل دخل بہت کم رہا۔ نتیجتہً وہاں مقامی نیشنلزم کی جڑیں بھی خوب گہری ہوئیں اور تہذیبی و ثقافتی روایات بھی پختگی کے ساتھ قائم ہوئیں — مزید برآں وہاں کے لوگ مقامی سرداروں اور حکمرانوں کی تو بدترین غلامی کو بھی برداشت کرنے کے عادی بنے اس لئے کہ یہ مقامی سردار اور حکمران سے " خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر ۔ پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری ،، کے مصداق اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے مقامی نیشنلزم کو بھی استعمال کرتے رہے — لیکن یہ واقعہ ہے کہ سندھیوں اور بلوچوں میں بیرونی فاتحین اور بدیسی حکمرانوں کے ساتھ سازگاری کی صلاحیت پیدا نہیں ہوسکی بلکہ ان کے دلوں میں ایسی حکومتوں کے خلاف ہمیشہ نفرت اور بغاوت کے جذبات موجود رہے !

اس طویل تاریخی پس منظر پر مستزاد ماضیٔ قریب کی تاریخ کا وہ اہم واقعہ جس نے پاکستان کے شمالی اور جنوبی حصوں کے لوگوں ، خصوصاً پنجابیوں اور سندھیوں کے مابین موجودہ ذہنی و نفسیاتی بُعد پیدا کرنے میں سب سے مؤثر حصہ ادا کیا ہے ، یہ ہے کہ اگرچہ اس پورے

علاقے میں انگریزی راج تقریباً ایک ہی وقت شروع ہوا، یعنی انیسویں صدی کے وسط کے لگ بھگ ـــــ لیکن اس وقت تک سندھ اور بلوچستان دونوں آزاد تھے ـــــ چنانچہ سندھ میں تالپوروں کی باضابطہ حکومت قائم تھی اور بلوچستان میں خان آف قلات کی سربراہی میں قبائلی نظام قائم تھا، گویا انگریز نے حکومت براہِ راست مسلمانوں سے چھینی، لہٰذا سندھیوں اور بلوچوں میں انگریز کی جبری غلامی کے باوجود انگریزوں سے نفرت و عداوت ہی نہیں باضابطہ بغاوت کے جذبات مسلسل موجود رہے ـــــ جبکہ انگریز کی آمد سے قبل پنجاب پر "سکھا شاہی"، مسلط تھی جو محض غلامی ہی نہیں ظلم و ستم اور قہر و عذاب کی بدترین صورت تھی ـــــ لہٰذا یہاں انگریز گویا مسلمانوں کا محسن اور نجات دہندہ بن کر آیا اور اس نے پنجابی مسلمانوں کو توہین و تذلیل، لوٹ مار، اور بدترین جبر و استبداد کے پنجے سے چھڑا کر ایک قانونی اور رفاہی حکومت کا تحفہ دیا ـــــ نتیجتاً یہاں کے مسلمانوں میں انگریز دشمنی کی بجائے "ھَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَان" کے عین مطابق انگریزوں کی خیر خواہی اور وفاداری کے جذبات پیدا ہوئے۔ اگرچہ انگریزوں نے اپنی روایتی چال بازی اور عیاری سے کام لیتے ہوئے اس کا بہت ناجائز فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ اوّلاً پنجابی مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان میں اپنے استعمار کو مستحکم کیا اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران دارالسلطنت دہلی جو ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا اُن ہی کی مدد سے دوبارہ فتح کیا ـــــ اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی جنگِ عظیم کے دوران پنجابی مسلمانوں کا سستا خون خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے لئے استعمال کیا ـــــ واضح رہے کہ سکھوں کی براہِ راست عملداری میں پنجاب کے ساتھ ساتھ صوبۂ سرحد کے بعض علاقے تو مستقلاً شامل تھے اور باقی اکثر حصّے کی حیثیت بھی ان کے باج گذار کی سی تھی، یہی وجہ ہے کہ انگریزوں کے ضمن میں متذکرہ بالا نفسیاتی کیفیت پنجاب کے ساتھ ساتھ سرحد کے بھی بہت سے علاقوں کے لوگوں میں پیدا ہوئی اور انگریزی فوج میں پنجابی مسلمانوں کے شانہ بشانہ سرحد کے بعض علاقوں بالخصوص مردان، پشاور اور کوہاٹ کے اضلاع کے لوگ بھی شریک ہوئے!

ان دو اہم وجوہات کی بنا پر پاکستان میں قائم ہونے والے جابرانہ اور استحصالی نظام کے

خلاف ، جسے ' دیسی نوآبادیاتی نظام ' سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ' پنجاب اور سرحد کے لوگوں میں تو کوئی خاص ردِّعمل پیدا نہیں ہوا لیکن سندھ اور بلوچستان میں شدید ردِّعمل رونما ہوا خصوصاً اس لئے کہ ' جیسے کہ ابھی وضاحت کی جائے گی ' اس ' دیسی امپیریلزم ' میں پنجاب کی بالادستی کا عنصر بھی شامل ہو گیا جو سندھ اور بلوچستان کے مقامی نیشنلزم کی نگاہ میں بہرحال ' بدیسی ' تھا

سندھ اور بلوچستان میں اس ردِّعمل کے ظہور کی مختلف صورتوں کا سبب یہ ہے کہ چونکہ بلوچستان میں ازمنۂ قدیم کا قبائلی نظام پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ قائم تھا ' چنانچہ وہاں یا تو مالکِ مطلق اور مختارِ کل قبائلی سردار تھے یا ایسے جاہل و غافل عوام جو بہ اعتبار سے " کالانعام " تھے اور کوئی درمیانی طبقہ سرے سے موجود ہی نہیں تھا لہٰذا وہاں ردِّعمل وقتاً فوقتاً قبائلی شورش اور بغاوت کی صورت میں تو ظاہر ہوا لیکن اس نے کسی مستقل عوامی تحریک کی صورت اختیار نہیں کی ـــــ جبکہ سندھ میں اس کے برعکس ایک مضبوط مڈل کلاس بھی موجود تھی اور تعلیمیافتہ طبقہ بھی لہٰذا وہاں اس ردِّعمل نے ایک مسلسل سلگنے والی آگ کی صورت اختیار کر لی جو اگرچہ فوری طور پر تو ظاہر نہیں ہوتی لیکن اندر ہی اندر بڑھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے !

افسوس کہ اس صورتِ حال کی جانب نہ پاکستان کے بہی خواہوں نے توجہ دی نہ اسلام کے علمبرداروں نے ۔ بلکہ پاکستان اور پاکستانی قومیت کے نام لیوا سیاسی زعماء تو اختیارات اور مفادات کی بندر بانٹ اور چھینا جھپٹی ہی میں مصروف رہے ـــــ رہے دین کے علمبردار تو ان میں سے قدیم مزاج کے بزرگوں کی اکثریت تو ماحول سے بالکل لاتعلق رہتے ہوئے صرف قال اللہ اور قال الرسولؐ میں منہمک رہی ' ایک عظیم مذہبی تحریک صرف عبادات اور اتباعِ سنّت کی تلقین کرتی رہی ' بعض فرقہ پرست لوگ اسلام کے نام کو اپنی سیاسی مہم جوئی کے لئے استعمال کرتے رہے اور بعض بظاہر وسیع النظر اور جدید مسائل سے واقفیت رکھنے والے لوگ بھی عمرانیات کے مختلف گوشوں بالخصوص اقتصادیات اور معاشیات کے ضمن میں اسلام کی ان تعبیرات سے آگے نہ بڑھ سکے جو دورِ ملوکیت میں مرتب ہوئی تھیں ـــــ مزید برآں ' انہوں نے ' اقامتِ دین ' ایسے بلند و بالا نصب العین کے لئے انقلابی کے بجائے سیاسی طریقِ کار اور انتخابی سیاست کا راستہ اختیار کر کے اپنے آپ کو کم از کم ظاہری طور پر ان لوگوں سے

کے "مشابہ" بنالیا جو سیاسی میدان میں اسلام کا نعرہ محض اپنی مطلب برآری کے لئے لگاتے ہیں ــــ بہرحال ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ سندھ اور بلوچستان کے "غیر مطمئن" اور علامہ اقبالؔ کے الفاظ میں "حاضر و موجود سے بیزار" عناصر کو ظلم و استحصال کے اسباب کی توجیہہ و تشخیص مارکس کے نظریات میں، اور اس کا مداوا اور ازالہ، اور عدل و انصاف کے قیام کی واحد صورت اشتراکی نظام میں نظر آئی ــــ اور سندھ اور بلوچستان کی نوجوان تعلیم یافتہ نسل کا فیصلہ کن رجحان مارکس ازم اور کمیونزم کی جانب ہوتا چلا گیا۔ چنانچہ بلوچستان میں اُس کا ظہور "بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن" (B.S.O.) کی صورت میں ہوا ــــ اور سندھ میں اس نے اچانک "سندھ عوامی تحریک" (S.A.T.) کی صورت میں منظرِ عام پر آ کر عوام ہی نہیں، سیاسی مبصرین اور تجزیہ نگاروں تک کو حیران و ششدر کر دیا۔

الغرض یہ ہے سندھ کی عمومی بے چینی اور احساسِ محرومی کی سب سے زیریں اور تحتانی سطح جو بعض ثانوی عوامل کے زیادہ نمایاں ہونے کے باعث نظر آتی ہے۔ لیکن یہ سب سے بڑھ کر اہم اور سب سے زیادہ طاقت ور ہے ــــ اور اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ اس کا علاج نہ مارشل لاء میں ہے، نہ طاقت کے استعمال میں، اس لئے کہ ایسے معاملات میں طاقت کا استعمال عموماً "بڑھتا ہے ذوقِ جرم یہاں ہر سزا کے بعد!" کے مصداق اُلٹے نتائج پیدا کرتا ہے! ــــ اسی طرح اس کا مداوا نہ کفر کے فتوے جاری کرنے سے ہو سکتا ہے، نہ پاکستانی قومیت کی دہائی دینے سے، اور نہ ہی مذہبی اور قومی تقریبات پر پانی کی طرح پیسہ بہانے سے ــــ بلکہ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ عدل و قسط کو بالفعل قائم کیا جائے جس کے نتیجے میں نہ سماجی سطح پر کوئی امتیاز (DISCRIMINATION) باقی رہے، نہ سیاسی سطح پر جبر و استبداد (REPRESSION) اور نہ معاشی سطح پر ظلم و استحصال (EXPLOITATION)! بلکہ معاشرتی سطح پر گہری اسلامی اخوت اور کامل سماجی مساوات کا دور دورہ ہو اور سیاسی سطح پر اسلامی حریت اور دستوری و قانونی برابری کا نظام قائم ہو۔ بقول اقبالؔ:

؎ کُلُّ مُؤْمِنٍ اِخْوَۃٌ اندر دلِ اش ــــ حریت سرمایۂ آب و گلِ اش

ناشکیبِ امتیازات آمدہ!! ــــ در نہادِ او مساوات آمدہ!!

اور اس کے ساتھ ساتھ معاشی میدان میں ملکیت کی بجائے امانت کا تصور محسوس و مشہود ہو اور کفالت عامّہ کا اصول اور حصولِ رزق کے ذرائع اور ترقی کے مواقع کے ضمن میں کامل برابری بالفعل موجود ہو، بقول سعدیؒ

ع این امانت چند روزہ نزد ماست　　در حقیقت مالکِ ہر شئے خداست

اور بقول اقبالؒ

ع رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست　　ایں متاعِ بندہ و مِلکِ خداست

اور ع کس نہ باشد در جہاں محتاجِ کس　　نکتہ شرعِ مبین این است و بس!

اور چونکہ یہ جملہ مقاصد ایک ہمہ گیر اور کُلی اسلامی انقلاب کے بغیر حاصل نہیں کئے جا سکتے لہٰذا نہ صرف صوبۂ سندھ بلکہ پورے پاکستان کے اصل اور بنیادی مسئلے کا واحد حل —— اسلامی انقلاب ہے جو پیشِ نظر کتاب کا اصل موضوع ہے!

---

۲ پنجاب سے شدید نفرت

سندھ کے پیچ در پیچ مسئلے کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ قدیم سندھی آبادی اور خاص طور پر اُس کی نوجوان نسل میں پنجاب اور اہلِ پنجاب سے شدید نفرت کے جذبات پیدا ہو چکے ہیں، اور نفرت چونکہ نفرت ہی کو جنم دے سکتی ہے لہٰذا رفتہ رفتہ صورت باہمی بغض و عداوت کی بن رہی ہے اور اس صورتِ حال میں بلاشبہ پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے اہم خطرہ مضمر ہے!

اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ لیپا پوتی سے کام لیا جائے اور اس روایتی کبوتر کا طرزِ عمل اختیار کیا جائے جو بلّی کو دیکھ کر آنکھ بند کر لیتا ہے ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق کو تسلیم کیا جائے اور ان کے اسباب و محرّکات کا سراغ لگایا جائے تاکہ ایک دوسرے کی صحیح پوزیشن کے فہم و ادراک سے ایک دوسرے کے لئے حقارت کی بجائے "ہمدردی" کے جذبات پیدا ہوں۔

اس وقت واقعہ یہ ہے کہ ایک عام سندھی نوجوان پنجابیوں کو "دیسی سامراج" کی علامت اور اس "نئے نو آبادیاتی نظام" کے ذریعے ظلم و استحصال کا "مجرم" گردانتا ہے

جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اور جیسے کہ عرض کیا جا چکا ہے، اس احساس کی پیدائش کا اوّلین سبب تو پاکستان کی اس مرکزی سول سروس کی بدعنوانیاں تھیں جس میں پنجابیوں کا تناسب 'حصّہ بقدرِ جثّہ' کے اصول کے مطابق سب سے بڑھ کر تھا۔ پھر اس جلتی آگ پر تیل کا کام کیا مارشل لاء کے تسلسل اور طوالت نے ـــــ اور اس پر مزید اضافہ ہوا کچھ ان پنجابی آبادکاروں کے ذریعے جنہوں نے، بقول اہلِ سندھ، سندھ کی بہترین زمینوں پر "قبضہ" کر لیا۔ اور کچھ ان پنجابی صنعت کاروں اور تاجروں کے ذریعے جو خصوصاً کراچی کی صنعت و تجارت کے قابلِ لحاظ حصّے پر "قابض" ہو گئے۔ (واضح رہے کہ سول اور فوجی افسروں کو جو زمینیں 'بانداز خسروانہ' سندھ میں نئے تعمیر شدہ بیراجوں سے سیراب ہونے والے علاقوں میں مرحمت فرمائی گئیں اُن کا مسئلہ جداگانہ اور اُس نئے نوآبادیاتی نظام کا شاخسانہ ہے جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔)

موجودہ صورتِ حال کے کامل فہم و شعور کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ بھی نوٹ کر لیا جائے کہ جواباً ایک عام پنجابی سندھیوں کو سُست اور کاہل، اور آرام پسند اور نااہل، اور سفر سے خوف کھانے والا ہی نہیں بزدل اور ڈرپوک بھی سمجھتا ہے! (اگرچہ ۸۳ء اور ۸۶ء کے اندرونِ سندھ ہنگاموں اور سندھ میں ڈاکوؤں کی حالیہ ترک تازیوں نے کم از کم مؤخر الذکر تاثر کو بہت حد تک ختم کر دیا ہے!)

اس صورتِ حال کا اہم ترین سبب تو سندھ اور پنجاب کے قدیم تاریخی پس منظر اور بالخصوص انگریزی دَور میں پیدا شدہ اجتماعی نفسیات کے اُس فرق و تفاوت کے پیشِ نظر بآسانی سمجھا جا سکتا ہے جس پر اس سے قبل تفصیلی روشنی ڈالی جا چکی ہے ـــــ یعنی یہ کہ چونکہ انگریزوں نے سندھیوں میں نفرت و عداوت ہی نہیں بغاوت کے جذبات محسوس کئے لہٰذا اس نے اپنی فوج کے دروازے بھی ان پر بالکل بند کر دیئے اور اس کی وجہِ جواز کے طور پر یہ مشہور کر دیا کہ سندھی بزدل اور غیر عسکری قوم (NON-MARTIAL RACE) ہیں اور تعلیم کے میدان میں بھی سندھ میں کوئی خاص پیش رفت نہیں کی جس کے نتیجے میں انگریزی فوج میں تو سندھیوں کا تناسب صفر رہا ہی، عام تعلیم کے میدان میں بھی سندھی مسلمان بحیثیتِ مجموعی پیچھے رہ گئے ـــ

اور ایک تو عام سندھی ویسے ہی خاموش اور شرمیلا اور اپنی قدیم تہذیبی روایات کے زیر اثر کچھ لئے دیئے اور الگ تھلگ (RESERVED) رہنے والا تھا، اس پر مستزاد مسلسل ایک سو سال کے مخالفانہ پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے خول میں بالکل ہی بند ہو کر رہ گیا اور کم از کم وقتی طور پر اس کے اندر حدودِ سندھ سے باہر کسی قسمت آزمائی (ENTERPRISE) کا رجحان نہ رہا۔ حالانکہ اس سے قبل خصوصاً خلیج کے علاقے اور حجاز مقدس کے ساتھ سندھیوں کے تجارتی روابط بہت مضبوط تھے، چنانچہ جب ۱۹۶۲ء میں پہلی بار حج کی سعادت نصیب ہوئی تو راقم الحروف نے مکہ مکرمہ کے بازاروں میں سائن بورڈوں پر "السندی" کا لفظ بکثرت لکھا دیکھا اور دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ سندھی تو ہیں لیکن چونکہ انہیں وہاں سے نقلِ مکانی کئے کئی نسلیں بیت گئی ہیں لہٰذا یہ معلوم نہیں کہ وہ سندھ کے کس شہر سے عرب آئے تھے۔! (واضح رہے کہ بالکل یہی معاملہ بہت سے بہاری مسلمانوں کا ہے جو جزائر غرب الہند (WEST INDIES) میں آباد ہیں لیکن کئی نسلیں بیت جانے کے باعث اب انہیں اپنے جدی وطن کا نام بھی صحیح یاد نہیں ہے۔ اور وہ 'بہار' کا تلفظ 'بیار' کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگریز کی آمد کے بعد یا تو کچھ حریت پسند لوگ از خود ہجرت کر کے دنیا کے دوسرے حصّوں میں چلے گئے تھے۔ یا انگریزوں نے ان میں بغاوت کے جراثیم دیکھ کر ان کو جہازوں میں بھر بھر کر قریب کے "کالے پانی" کے بجائے ایک نہایت دور کے 'کالے پانی' بھیج دیا۔ چنانچہ اس علاقے کے ایک مسلمان سے جب امریکہ میں ملاقات ہوئی تو اس نے بعینہٖ یہی بات کہی۔ راقم کا گمان غالب ہے کہ کچھ اسی طرح کا معاملہ سندھ میں پیش آیا کہ انگریز کی آمد پر کچھ حریت پسند سندھی عرب ہجرت کر گئے اور تین چار نسلوں کے بعد اب انہیں ان شہروں کے نام بھی یاد نہیں رہے جن سے انہوں نے نقل مکانی کی تھی)۔

اس کے برعکس پنجابیوں کے لئے انگریز نے نہ صرف یہ کہ اپنی فوج کے دروازے چوپٹ کھول دیئے بلکہ ان کی باضابطہ حوصلہ افزائی کی، مزید برآں اُن ہی میں سے اپنی سول سروس کے لئے بہترین کل پُرزے حاصل کرنے کے لئے سکولوں اور کالجوں اور خصوصاً مشنری اداروں کا جال پنجاب بھر میں پھیلا دیا۔ اُدھر پنجابیوں نے بھی بحیثیت مجموعی بدیسی حکمرانوں کی ان

نوازشوں کا پوری خوشدلی اور قلبی و ذہنی آمادگی کے ساتھ خیر مقدم کیا اور اس طرح انگریز کی سول سروس اور فوج میں پنجابی مسلمانوں کو اہم مقام حاصل ہو گیا۔ اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی اس پوزیشن سے تحریک مسلم لیگ کو تقویت پہنچائی اور قیام پاکستان کے ضمن میں مؤثر رول ادا کیا ـــ لیکن اس کا یہ نتیجہ بہرحال نکلا کہ انگریز کے رخصت ہونے اور خصوصاً قائد اعظم کے انتقال فرمانے کے بعد جو لوگ "تاج و تخت" حکومت پاکستان کے وارث بنے یعنی مرکزی بیوروکریسی کے ارکان اور فوج کے جرنیل ان میں اہل پنجاب کا پلڑا سب سے بھاری تھا۔ چنانچہ وہی اس نئے "دیسی سامراج" کے سربراہ یا علامت بن گئے۔

یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے قیام کو بھی، جو اصلاً پاکستان کے مشرقی اور مغربی خطوں کے مابین لاینحل دستوری مسئلے کا واحد ممکن حل تھا، سندھ میں اسی نظر سے دیکھا گیا کہ یہ پنجابی سامراج کے پورے مغربی پاکستان پر فیصلہ کن اور بلا شرکت غیرے قبضے کی آخری اور بھرپور کوشش ہے۔ اور بدقسمتی سے پاکستان کی اس وقت کی بے بصیرت قیادت نے ون یونٹ کا صدر مقام لاہور کو قرار دے کر اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا ـــ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اگر ون یونٹ کا صدر مقام ملتان کو بنایا جاتا جو لسانی اور ثقافتی، اور جغرافیائی اور مواصلاتی ہر اعتبار سے مغربی پاکستان کا مرکز تھا تو اتنا شدید ردّ عمل ہرگز پیدا نہ ہوتا۔

حاصل کلام یہ کہ ـــ اصولی اور مجموعی اعتبار سے پنجاب سے سندھ کی شکایات بے بنیاد نہیں ہیں۔ اگرچہ، جیسے کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، اس ضمن میں اصل موردِ الزام پوری پنجابی قوم نہیں بلکہ اس کے صرف دو طبقے بنتے ہیں۔ یعنی ایک فوج جو اکثر و بیشتر پنجاب کے صرف شمالی حصے سے تعلق رکھتی ہے اور دوسرے سول بیوروکریسی جو زیادہ تر بھارتی اور پاکستانی پنجاب کے وسطی اضلاع سے ہے۔ بقیہ پورے پنجاب کو بحیثیت مجموعی اور مذکورہ حصوں کے بھی عام لوگوں کو موردِ الزام ٹھہرانا یقیناً زیادتی ہے۔

اسی طرح ان زمینوں سے قطع نظر جو اسی سول اور ملٹری بیوروکریسی نے بطورِ "انعام" غصب کیں، ان تمام پنجابی آبادکاروں کو مطعون کرنا یقیناً بہت بڑی ناانصافی ہے جنہیں قدرت نے بنجر اور غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے اور ان سے بھی "رزقِ خود را از زمیں بُردن رواست"

کے مصداق اپنے اور اہل وطن کے لئے غذا حاصل کرنے کی بے پناہ صلاحیت سے نوازا ہے اور جنہیں ابتدا میں تو بڑی تحریص و ترغیب یہاں تک کہ منت خوشامد کے ساتھ سندھ لایا گیا تھا!

اس ضمن میں بھی اس تاریخی پس منظر کی وضاحت مفید ہوگی کہ انگریزوں کے تعمیر کردہ نہری آبپاشی کے نظام سے قبل مغربی پنجاب کے بھی اکثر و بیشتر حصے کی معیشت اور وہاں کے رہنے والوں کی مزاجی کیفیت بالکل ویسی ہی تھی جیسی اہل سندھ کی ـــــ یعنی چونکہ علاقہ اکثر و بیشتر بنجر اور صحرائی تھا اور زرعی معیشت کا کل دارومدار دریاؤں کی طغیانی کے ذریعے سیراب ہونے والی زمینوں پر تھا یا کچھ تھوڑا بہت بارانی کاشت پر، لہٰذا زیادہ محنت و مشقت کا مادہ نہ یہاں کے لوگوں میں تھا نہ وہاں کے لوگوں میں اور توکل و قناعت کا دور دورہ وہاں بھی تھا اور یہاں بھی ـــــ اس کے برعکس سابق متحدہ پنجاب کے تلہیٹی کے علاقے یعنی سیالکوٹ، گورداسپور، امرتسر، جالندھر اور ہوشیارپور کے اضلاع بے حد سرسبز بھی تھے اور گنجان آباد بھی۔ چنانچہ یہاں کے لوگوں میں (بشمول سکھ اور مسلمان) زراعت اور کاشت کاری کی بے پناہ مہارت اور استعداد پیدا ہوگئی۔ اور چونکہ آبادی میں اضافے کی بنا پر رفتہ رفتہ رقبے چھوٹے چھوٹے رہ گئے تھے لہٰذا ـــــ ایک جانب تھوڑی زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کی جدّ و جہد نے ان کی زراعت میں مہارت میں مزید اضافہ کیا، دوسری طرف متبادل ذرائع معاش کی تلاش نے لوگوں کو نہ صرف عام تعلیم بلکہ فنّی اور پیشہ ورانہ مہارت کے حصول کی طرف متوجہ کیا، یہی وجہ ہے کہ پنجاب نے جو بہترین ہیوروکریٹ اور ٹیکنوکریٹ پیدا کئے اُن کی اکثریت کا تعلق اسی علاقے سے ہے۔ اور تیسری طرف حصولِ معاش کے لئے نہ صرف اپنے ملک کے دوسرے علاقوں بلکہ ملک سے باہر جاکر قسمت آزمائی کرنے پر بھی آمادہ کیا۔

یہی وجہ ہے کہ جب وسطی اور مغربی پنجاب میں نہروں کا جال پھیلا اور نئے آباد کاروں کی ضرورت پیش آئی تو ان ہی علاقوں کے لوگ ترکِ سکونت کرکے آئے اور انہوں نے کمال محنت و مشقت اور مہارت و اہلیت کا ثبوت دیتے ہوئے ان علاقوں کو آباد کیا۔ اور اس کام میں پنجاب کے ان علاقوں میں پہلے سے رہنے والے لوگوں نے کم از کم ابتدائی دور میں کوئی حصّہ

نہیں لیا۔ بعد میں جب سابق ریاست بہاولپور اور اُپر سندھ میں نہریں نکلیں اور بیراج بنے تو بعینہٖ یہی صورت وہاں بھی پیش آتی رہی۔ اور سندھ کے سابق قناعت پسند اور آرام طلب لوگوں نے بھی بالکل مغربی پنجاب کے پرانے باشندوں کی طرح ان پنجابی آبادکاروں کو حیرت و استعجاب کے ساتھ بالکل مٹی ہو کر مٹی میں ملتے دیکھا ـــــ لیکن جب ان کی محنت و مشقت کے نتائج برآمد ہوئے اور زمینوں نے سونا اگلنا شروع کر دیا تو انسان کی طبعی کمزوری کے باعث منفی جذبات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ حالانکہ سندھی بھائیوں کو سوچنا چاہیئے کہ اپنی محنت و مشقت کی عادت کے بل پر یہ پنجابی آبادکار اور محنت کش صرف سندھ ہی میں نہیں بلکہ دُنیا کے کونے کونے حتّٰی کہ امریکہ اور کینیڈا کے مغربی ساحل تک پر موجود ہیں۔

بالکل اسی طرح کا معاملہ پنجابی صنعت کاروں اور تاجروں کا ہے۔ عجیب بات ہے کہ آبادکاروں کے برعکس پنجاب کی تاجر برادریوں کی اکثریت کا تعلق مغربی پنجاب سے ہے یعنی چنیوٹ، چکوال، پنڈ دادنخان، جھنگ اور ملتان کی شیخ برادریاں، اور ان لوگوں کو اللہ نے تجارت کی جو مہارت عطا فرمائی ہے اس کے طفیل یہ لوگ تقسیم ہند سے بہت پہلے پنجاب سے نکل کر دہلی اور یوپی، حتّٰی کہ بنگال تک کی تجارت میں نمایاں حصّہ دار بن گئے تھے۔ ان میں سے بعض برادریوں مثلاً چنیوٹی شیخوں نے تو اپنی پنجابی زبان اور ثقافت کو بھی برقرار رکھا اور اپنے آبائی شہروں سے بھی تعلق رکھا اور بعض برادریوں نے (جن کا مجموعی نام "قوم پنجابی سوداگران دہلی" ہے) بالکلیہ یوپی ہی کی طرزِ معاشرت اور اردو زبان کو اختیار کر لیا۔ چنانچہ اب وہ صرف نام کے پنجابی رہ گئے ہیں ـــ اب اگر ان لوگوں نے قیام پاکستان کے بعد گجرات کے میمنوں اور بمبئی کے خوجوں اور بوہروں کے ساتھ ساتھ اپنی محنت اور مہارت کی جولانگاہ کراچی اور سندھ کو بنایا تو اس میں کون سے جُرم کی بات ہے ـــــ اگرچہ یہ بحث بالکل جُدا ہے کہ موجودہ سرمایہ داری اور ارتکازِ دولت میں اصل محنت و مہارت کا حصّہ کتنا ہے اور سودی اور ساہوکاری نظام، غیر شرعی بیع و شریٰ، سرکاری واجبات کی چوری اور سب سے بڑھ کر رشوت اور بد دیانتی کا حصّہ کتنا! ـــ اس لئے کہ یہ معاملات افراد و اشخاص سے نہیں بلکہ "نظام" سے متعلق ہیں اور ان کا تعلق کسی ایک قوم یا قومیت سے نہیں بلکہ پوری پاکستانی قوم اور معاشرے

سے بحیثیتِ مجموعی ہے اور ان خباثتوں کا کلی علاج بھی ایک کامل اسلامی انقلاب کے بغیر ناممکن ہے، جس کے بعد زمین کا بھی شریعتِ اسلامی کے مطابق بالکل "نیا بندوبست" ہوگا اور "سرمایہ کاری" کے لئے صحت مند فضا کے برقرار رہتے ہوئے "سرمایہ داری" کی جملہ راہیں بھی مسدود ہو جائیں گی۔

لہٰذا سندھی بھائیوں کو پنجاب اور اہلِ پنجاب کے خلاف اپنے "مقدمے" پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے اور معاملہ فی الواقع جیسا کچھ اور جتنا کچھ ہے اسی حد تک رکھنا چاہیئے اور جذبات کی رَو میں بہہ کر اس میں غلط اضافے نہیں کر لینے چاہئیں!

اسی طرح، پنجابیوں کا بھی ایک مغالطہ تو، جیسے کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، رفع ہو ہی گیا ہے، یعنی یہ کہ سندھی لڑاکا یا بہادر قوم نہیں ہیں، اس پورے تاریخی پس منظر کے سامنے آجانے کے بعد باقی غلط فہمیاں بھی رفع ہو جانی چاہئیں اور اپنے سندھی بھائیوں کی عظمت کا نقش ان کے دل پر قائم ہو جانا چاہیئے کہ انہوں نے انگریزی حکومت کو ایک دن کے لئے بھی ذہناً قبول نہیں کیا۔ بلکہ ۱۹۴۶-۱۹۴۵ء تک جب کہ سندھ پر انگریزوں کے تسلط کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا تھا سندھ کے "حُرّ" اپنے خون سے حُرّیت پسندی کی داستانیں رقم کر رہے تھے یہاں تک کہ انگریزوں نے موجودہ پیر پگاڑا صاحب کے والد ماجد ایسی عظیم دینی و روحانی شخصیت کو نہ صرف یہ کہ موت کی سزا دی بلکہ ان کا جسدِ خاکی بھی اس لئے واپس نہیں کیا کہ انہیں یقین تھا کہ ان کا مزار جہاں بھی ہوگا تحریکِ حُرّیت و جہاد کا عظیم مرکز بن جائے گا!

پھر یہ سندھ کی اسی حُرّیت پرور فضا کا ثمرہ ہے کہ اس نے قائدِ اعظم محمد علی جناح ایسی عظیم شخصیت کا تحفہ پوری ملتِ اسلامیہ پاک و ہند کی خدمت میں پیش کیا ـــــ مزید برآں پاکستان کے موجودہ صوبوں میں سے سندھ ہی وہ واحد صوبہ تھا جہاں مسلم لیگ کی حکومت قائم ہوئی ـــــ بلکہ ہندوستان کے پورے طول و عرض میں سندھ ہی وہ واحد صوبہ تھا جس کی اسمبلی نے ۱۹۴۳ء میں پاکستان کے حق میں قرارداد پاس کی تھی۔ الغرض! برِّ عظیم پاک و ہند میں صوبۂ سندھ نہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے اعتبار سے کسی سے پیچھے تھا نہ خود اختیاری

کی جدّ وجہد میں ، بلکہ واقعہ اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ ان جملہ اعتبارات سے سندھ کم ازکم موجودہ پاکستان کے تمام علاقوں سے تو بہت آگے تھا!

گویا اصل ضرورت اس کی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھا جائے ، ایک دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کیا جائے اور ایک دوسرے کی خامیوں اور کوتاہیوں پر باہم طعنہ زنی کی بجائے ان کے اسباب و علل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے ہمدردی ، کی جائے[۱]، بمصداقِ آیۂ قرآنی :

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا	ترجمہ " اے ایمان والو! تم میں سے کوئی
لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ	قوم دوسری قوم کا مذاق نہ اڑائے ، کیا عجب
عَسٰٓی اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا	کہ وہ ان سے بہتر ہوں ۔ نہ ہی کوئی عورتیں
مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ	دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں ، ہو سکتا
نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا	ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور اپنے آپ
مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا	کو عیب مت لگایا کرو ، نہ ہی ایک دوسرے
اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۚ	کے (چڑانے والے) نام رکھ لیا کرو ۔
بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ	ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی بُرا ہے ۔
الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ	اور جو باز نہیں آئے گا تو وہی لوگ ظالم قرار
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝	پائیں گے ۔" (سورۂ حجرات : آیت ۱۱)

---

[۱] یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل امیرِ جماعتِ اسلامی میاں طفیل محمد کے کسی بیان میں سندھیوں کے فوج میں بھرتی نہ ہونے کا ذکر طعن آمیز انداز میں تھا جس کے جواب میں سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب نے کہا تھا " ہمیں فخر ہے کہ ہم کبھی کرائے کے فوجی نہیں رہے ۔!" گویا ع " دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی!"

قرآن —— معیارِ حق و باطل اور
سنت —— صراطِ مستقیم کا عملی نمونہ ہے

۳۔ مہاجرین کا خوف

سندھ کی قدیم آبادی میں غیر معمولی احساس محرومی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ترکِ وطن کرکے پاکستان آنے والوں یعنی "مہاجرین" کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ متعدد اسباب کی بنا پر مہاجرین کا "خوف" بھی قدیم سندھیوں کی اجتماعی نفسیات کا جزوِ لاینفک بن گیا ہے۔

ان اسباب میں سے بھی اوّلین تو یہی تھا کہ پاکستان کی مرکزی حکومت پر ابتداءً مہاجرین کا "غلبہ" تھا اور نہ صرف یہ کہ پہلی مرکزی کابینہ میں سب سے بڑی تعداد مہاجرین کی تھی اور مرکزی بیوروکریسی میں بھی وہ معتدبہ تعداد میں موجود تھے (چنانچہ جب تک مرکزی دارالحکومت کراچی میں رہا دیکھنے والوں کو یہی محسوس ہوا کہ پاکستان پر مہاجرین کی "حکومت" ہے) بلکہ سندھ کی عمومی تعلیمی پسماندگی کی بنا پر صوبائی محکموں میں بھی مہاجرین کا پلڑا بھاری تھا اور ایک عام دیہاتی سندھی بھی یہی محسوس کرتا تھا کہ مہاجر ہم پر حاکم ہو گئے ہیں، اگرچہ بعد میں یہ صورتحال تیزی سے تبدیل ہو گئی۔

ثانیاً ــــ ہندوؤں کے ترکِ وطن سے، اگرچہ وہ جزوی تھا، جو معاشی اور اقتصادی خلاء پیدا ہوا وہ بھی لامحالہ مہاجرین ہی کے ذریعے پُر ہوا، چنانچہ ایک جانب سندھ کی شہری جائداد اور تجارت پر مہاجرین کا "قبضہ" ہو گیا ــ تو دوسری جانب سندھ کی وہ چالیس فی صد کے لگ بھگ زرعی زمین بھی، جو ہندوؤں نے مقامی مسلمانوں سے اپنے سودی اور ساہوکارانہ ہتھکنڈوں کے ذریعے ہتھیالی تھی، متروکہ جائداد کی حیثیت سے مہاجرین کو الاٹ ہو گئی[1] (اگرچہ اب سندھی نیشنلزم کے دباؤ کے تحت مہاجرین اس زرعی زمین کا اکثر و بیشتر حصّہ یا تو اونے پونے بیچ چکے ہیں یا ویسے ہی چھوڑ دینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔)

اس ضمن میں یہ بات اہمیت کے ساتھ نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ سندھ میں ہندوؤں نے انگریزوں کی زیرِ سرپرستی اور ان کی باضابطہ حوصلہ افزائی اور تائید و امداد سے (جس کا

---

[1] اس سلسلے کی تلخ ترین حقیقت یہ ہے کہ تقسیمِ ہند سے قبل ہندو بنیوں (باقی اگلے صفحہ پر ملاحظہ ہو)

سبب وہی تھا جو پہلے بیان ہو چکا، یعنی یہ کہ چونکہ انگریز سندھی مسلمان سے شدّت سے خائف تھا اور اُسے اُس میں بغاوت کے جراثیم نظر آتے تھے، لہٰذا اُس نے اسے دبانے کے لئے ہندو کی حوصلہ افزائی کی، معاشی استحصال کا جو جال پھیلایا تھا اس کی بنا پر سندھ کے باشعور مسلمان اُن سے سخت نالاں تھے۔ چنانچہ یہ بات بہت سے لوگوں کے لئے حیرت و استعجاب کا باعث ہوگی کہ، پاکستان کے ایک قومی روزنامے[1] میں حال ہی میں شائع ہونے والے مضمون کے مطابق، قیامِ پاکستان سے لگ بھگ چار سال قبل اس شخص نے جو آج سندھی نیشنلزم کا سب سے بڑا علمبردار اور "مہاجر و پنجابی سامراج" سے نفرت و عداوت کی سب سے بڑی علامت، بن چکا ہے سندھی ہندوؤں کی دُہائی دیتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کو دعوت دی تھی کہ وہ سندھ آکر یہاں کے مسلمانوں کو ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے نجات دلائیں۔ چنانچہ اواخر دسمبر ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جو سالانہ اجلاس قائدِ اعظم مرحوم کی زیرِ صدارت کراچی میں منعقد ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین جی ایم سیّد نے کہا تھا:

"ہندو سندھ میں رہنے کے باوجود بھارت کے ہندوؤں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ اس

(تسلسل)، اور ساہوکاروں کی دست بُرد سے زمینداروں کو بچانے کی جو کوششیں پنجاب میں سر چھوٹو رام اور ان کے ساتھیوں نے کی تھیں، اسی طرح کی ایک کوشش سندھ میں بھی صوبائی اسمبلی کے بعض مسلمان اراکین نے کی تھی۔ لیکن اس موقع پر بہت سے نام نہاد مسلمان وڈیرے ہندو سرمایہ داروں کے ہاتھوں بک گئے اور انہوں نے طرح طرح کے تاخیری ہتھکنڈوں سے کام لے کر مجوّزہ بل کو پاس ہونے سے روک دیا۔ ورنہ وہ ساری زرعی زمینیں جو ہندو ساہوکاروں کے پاس رہن تھیں اور اسی بنا پر تقسیم کے بعد متروکہ جائداد قرار پاکر مہاجرین کو الاٹ ہوئیں اسی وقت سندھ کے مسلمانوں کو واپس مل جاتیں ـــــ واضح رہے کہ پنجاب میں تو زمیندار مسلمان بھی تھے اور ہندو اور سکھ بھی تھے، لیکن سندھ میں کوئی غیر مسلم اصلاً زرعی زمین کا مالک نہیں تھا اور زرعی اراضی کُل کی کُل مسلمانوں کی ملکیت تھیں!

[1] روزنامہ "نوائے وقت"، تحریر جناب محمد علی

لئے سندھ کے مسلمان بھی امید رکھتے ہیں کہ برصغیر کے مسلمان ان (یعنی سندھی مسلمانوں) کے ساتھ اشتراکِ عمل کریں گے۔ بھارت کے مسلمان ہماری بڑی مدد کر سکتے ہیں۔ سندھ کے رہنے والے زراعت سے وابستہ ہیں اور تجارت میں بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے بھارت کے مسلمان سندھ میں آکر اپنے تجربے اور مہارت سے تجارت میں سندھی مسلمانوں کی پس ماندگی کو ختم کر سکتے ہیں اور سندھ خوشحالی اور ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔"

لیکن اوّل تو اس وقت یہ ایک خالص نظری سی بات تھی اور اس کا حقیقت و واقعہ کا روپ دھار لینا بہت ہی بعید از قیاس تھا، پھر یہ تو کسی طرح بھی اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ تبادلۂ آبادی اتنے بڑے پیمانے پر ہو جائے گا۔ لہٰذا اس میں مضمر 'خطرات' کی طرف اور کسی کا تو کیا خود جی ایم سید صاحب کا ذہن بھی منتقل نہیں ہو سکا ــــ چنانچہ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سندھ میں آنے والے مہاجرین کا سندھی مسلمانوں نے نہایت پُرتپاک خیر مقدم کیا اور انہیں تمام ممکن سہولتیں اور مراعات بہم پہنچائیں لیکن افسوس کہ یہ کیفیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی اور دو اہم اسباب کی بنا پر اوّلاً ' (ANTI-CLIMAX) ' اور پھر ضابطہ ردِّ عمل (REACTION) کی صورت پیدا ہوتی چلی گئی۔

اوّلاً اس بنا پر کہ ــــ بھارت سے ہجرت کر کے آنے والوں کا معاملہ ۱۹۴۸ء ہی میں ختم نہیں ہو گیا۔ بلکہ یہ سلسلہ اس کے بعد بھی تواتر کے ساتھ جاری رہا اور اس طرح آبادی میں مہاجرین کا تناسب مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ نتیجۃً قدیم سندھیوں کے تحت الشعور میں یہ 'خوف' کلبلانے لگا کہ کہیں وہ اپنے ہی صوبے میں اقلیت بن کر نہ رہ جائیں۔ اس جلتی آگ پر تیل کا اثر ہوا اس سے کہ جب پاکستان میں صنعت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اور اس کا سب سے بڑا مرکز کراچی بن گیا تو پاکستان کے شمالی صوبوں سے پنجابی اور پٹھان محنت کاروں کی سندھ منتقلی کی رفتار بھی بہت بڑھ گئی اور مہاجرین، پنجابیوں اور پٹھانوں کی مجموعی تعداد قدیم سندھیوں کی تعداد کے تقریباً برابر ہو گئی ــــ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خوف بھی جو ابتداء میں صرف 'مہاجر فوبیا' (PHOBIA) تھا وہ چند ہو گیا۔ چنانچہ اب قدیم سندھی برملا اس خطرے کا اظہار کر رہے ہیں کہ اگر یہ صورت جاری رہی تو ان کا حشر ریڈ انڈین لوگوں کا سا ہو گا اور اگرچہ اس میں

یقیناً حد درجہ مبالغے کا عنصر شامل ہے تاہم قدیم سندھیوں کے اپنے ہی صوبے میں اقلیت میں تبدیل ہو جانے کا اندیشہ بے بنیاد نہیں ہے، چنانچہ محولہ بالا مضمون کے مطابق :

"ایک ریٹائرڈ سندھی سی ایس پی آفیسر کے تحقیق و تجزیئے میں کہا گیا ہے کہ کراچی میں ہر سال ڈھائی لاکھ کے حساب سے پنجاب اور سرحد سے افراد آ رہے ہیں۔ اگر یہی رفتار برقرار رہی تو ۱۹۹۱ء تک سندھ میں پنجابی بولنے والوں کی آبادی پچاسی لاکھ پانچ ہزار چار سو دس ہو گی ۱۹۹۱ء تک پشتو بولنے والوں کی تعداد چوبیس لاکھ ہو گی۔ ۱۹۹۱ء میں اردو بولنے والوں کی تعداد اٹھانوے لاکھ چار ہزار دو سو بیس ہو گی۔ ۱۹۹۱ء تک پانچ لاکھ کشمیری سندھ میں آباد ہوں گے۔ اگر آبادی کی منتقلی کی یہی صورت حال رہی تو سندھ کی کل آبادی چار کروڑ چوبیس لاکھ ہو گی۔ جس میں سندھی بولنے والے دو کروڑ نو لاکھ، پنجابی بولنے والے پچاسی لاکھ، پشتو بولنے والے ستائیس لاکھ اور اردو بولنے والے اٹھانوے لاکھ اور کشمیری پانچ لاکھ ہوں گے۔ اس طرح مجموعی طور پر آئندہ چند سالوں میں سندھی بولنے والے مستقل طور پر اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے۔"

تو اگرچہ یہ 'خطرہ'، مہاجروں، پنجابیوں اور پٹھانوں کی مجموعی تعداد سے ہے، لیکن چونکہ اس غیر سندھی آبادی کا جزوِ اعظم بہرحال مہاجرین ہی پر مشتمل ہے، لہٰذا اس سے پیدا شدہ احساسِ محرومی اور نفرت و عداوت کا سب سے بڑا حصہ بھی لامحالہ ان ہی کے ساتھ منسلک ہو گیا ہے۔

چنانچہ یہی پس منظر ہے اس انتہائی تکلیف دہ اور افسوسناک صورتِ حال کا کہ قدیم سندھی مسلمان ان بہاری مسلمانوں کی منتقلی کا نام سننا بھی گوارا نہیں کرتے جنہیں اپنے 'پاکستانی' ہونے پر اصرار ہے اور جو اس وقت بنگلہ دیش میں انتہائی ذلت و افلاس اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے دن گن رہے ہیں اور منتظر ہیں کہ کب پاکستانی مسلمانوں کو رحم آئے اور انہیں بھی آزاد اور باوقار زندگی گذارنے کا موقع ملے۔ اس لئے کہ سندھی مسلمانوں کو یقین ہے کہ خواہ اس وقت پاکستان کے دوسرے صوبوں کے لوگ کتنی ہی فراخدلی کا مظاہرہ کریں اور ان بہاریوں کو اپنے یہاں آباد کرنے کی پیشکش کریں، وہ جلد یا بدیر لازماً سندھ ہی منتقل ہو کر رہیں گے اور

اسطرح آبادی کا توازن مزید بگڑ جائے گا۔

ثانیاً ـــــــ راقم کے تجزیئے کے مطابق قدیم سندھیوں کے "خوف" میں تناسب آبادی کا اور دیگر معاشی و اقتصادی عوامل سے بھی کہیں زیادہ دخل لسانی اور ثقافتی عوامل کو حاصل ہے۔ اس لئے کہ انہیں شدید اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں وہ قدیم سندھی تہذیب و ثقافت اور زبان و ادب بالکل ختم ہو کر نہ رہ جائیں جو انہیں بے حد عزیز ہیں۔ اور چونکہ یہ اندیشہ انہیں نہ پنجابیوں سے ہے نہ پٹھانوں سے بلکہ صرف مہاجروں اور اُن میں سے بھی خاص طور پر خالص اردو بولنے والوں سے ہے۔ لہٰذا اس کے حصے کا ردِّ عمل تو بالکلیہ ان ہی کے حصے میں آیا ہے ـــــــ اِدھر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ کراچی تو سرے سے سندھ کا شہر معلوم ہی نہیں ہوتا، حیدر آباد اور سکھر جیسے سندھ کے دوسرے بڑے شہروں پر بھی اردو زبان اور مہاجر تہذیب کا صریح غلبہ ہے، رہے باقی نسبتاً چھوٹے شہر تو ان میں بھی سندھی اور اردو زبانیں اور مہاجر اور مقامی تہذیبیں ایک دوسرے کی مدِّ مقابل اور بالکل برابر کی چوٹ نظر آتی ہیں۔ لہٰذا قدیم سندھی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو درپیش خطرہ وہمی اور خیالی نہیں حقیقی اور واقعی ہے۔ چنانچہ اسی کو ملک و ملت کے دشمنوں نے سب سے بڑھ کر استعمال (EXPLOIT) کیا اور اس "خوف" کو اُس جدید سندھی نیشنلزم کا سب سے بڑا جذبۂ محرکہ بنا دیا جس نے پچھلے پاکستان کی سالمیت کے لئے سب سے بڑے خطرے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ (واضح رہے کہ خوف کے جذبے کی بنیاد پر دنیا میں بڑی انہونی باتیں بھی ہو جاتی ہیں، چنانچہ خود پاکستان کے قیام کے اسباب و عوامل میں سب سے مؤثر عامل ہندوستان کی مسلم قوم کا یہ "خوف" ہی تھا کہ ہندو اس سے نہ صرف یہ کہ انصاف نہیں کرے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام لے!) ـــــــ اور چونکہ قدیم سندھی مسلمانوں کی جدید اجتماعی نفسیات کے اس پہلو پر عام طور پر توجہ نہیں دی جاتی اور یہ بات خاص طور پر پنجاب کے مسلمانوں کے تو بالکل سمجھ ہی میں نہیں آتی لہٰذا اس کے ضمن میں قدرے تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اوّلین اور اہم ترین حقیقت تو یہ پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ پنجاب اور سندھ

میں تبادلۂ آبادی کی نوعیت اور اس سے پیدا شدہ صورتِ حال ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے (بقیہ دو صوبوں یعنی سرحد اور بلوچستان تک تو مہاجرین کی بالکل نہ ہونے کے برابر تعداد ہی پہنچی لہٰذا ان کے ذکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے) اس لئے کہ اگرچہ آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ان دونوں صوبوں میں تبادلۂ آبادی تقریباً ایک ہی پیمانے پر ہوا، لیکن پنجاب میں صورت یہ بنی کہ پنجابی بولنے والے ہندو اور سکھ گئے تو اُن کی جگہ جو لوگ آئے اُن کی غالب اکثریت پنجابی بولنے والوں ہی پر مشتمل تھی، مزید برآں اُن میں سے اکثر کے ہم قوم بلکہ قریبی رشتہ دار مغربی پنجاب میں پہلے ہی "آبادکاروں" کی صورت میں موجود تھے ـــــ صرف انبالہ ڈویژن (حالیہ ہریانہ اسٹیٹ) سے آنے والوں لوگوں کی زبان و تہذیب قدرے مختلف تھی، لیکن ایک تو ان کی تعداد بہت کم تھی، دوسرے انہیں بارڈر کی طویل پٹی کے ساتھ ساتھ بہت منتشر صورت میں آباد کیا گیا ـــــ رہے خالص اردو بولنے والے دہلی، یوپی اور بہار وغیرہ کے مہاجرین تو پنجاب میں آباد ہونے والوں میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں تھی ـــــ لہٰذا پنجاب میں کوئی لسانی یا تہذیبی مسئلہ خالص عوامی اور دیہاتی سطح پر بھی پیدا نہیں ہوا۔ رہے پڑھے لکھے، روشن خیال اور باشعور شہری پنجابی تو وہ خواہ مغربی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے خواہ مشرقی پنجاب سے، سب قیامِ پاکستان سے بہت پہلے اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے قبول کر چکے تھے یہاں تک کہ پنجاب کے علمی و تعلیمی اور تہذیبی و ثقافتی مرکز لاہور کو تقسیمِ ہند سے بہت قبل پورے ہندوستان میں اردو ادب و صحافت کے سب سے بڑے مرکز کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ نتیجۃً یہاں اعلیٰ ثقافتی سطح پر بھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا ـــــ جب کہ اس کے بالکل برعکس سندھ میں سندھی بولنے والے ہندوؤں کی جگہ جو لوگ آئے ان میں غالب اکثریت تو دہلی، یوپی، بہار، سی پی اور حیدر آباد دکن کے خالص اردو بولنے والے لوگوں کی تھی، ان کے علاوہ راجپوتانہ سے آنے والوں کی زبان بھی اردو ہی تھی اگرچہ ذرا مجہول اور گھسی ہوئی، اور بمبئی، مدراس، کرناٹک اور کیرالا وغیرہ سے آنے والے بھی خواہ اپنے گھروں میں علاقائی زبانیں بولتے ہوں گھر سے باہر اردو ہی بولتے ہیں ـــــ اُدھر، جیسا کہ تفصیلاً عرض کیا

جا چکا ہے، سندھی زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کی تاریخ بہت طویل اور ان کی جڑیں بہت گہری ہیں اور سندھیوں کو اپنی زبان اور تہذیب سے والہانہ عشق ہے اور وہ ان پر بجا طور پر فخر کرتے ہیں ـــــ لہٰذا یہاں اردو اور سندھی کے مابین ویسا ہی تصادم پیدا ہوگیا جیسا تقسیم ہند سے کچھ عرصہ قبل اردو اور ہندی کے درمیان پیدا ہوا تھا۔ جس کا ذکر علاّمہ اقبال کے ظریفانہ اشعار میں اس طرح ہے ؎

اے شیخ و برہمن سُنتے ہو، کیا اہلِ بصیرت کہتے ہیں گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے
یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستورِ محبّت قائم تھا! یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

اردو اور سندھی کی اس بحث میں شدّت اور تلخی پیدا کرنے میں، مہاجر بھائیوں سے معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ، کچھ دخل ان کے 'احساسِ برتری' اور اس کے جا و بیجا اظہار کو بھی حاصل ہے ـــــ چنانچہ وہ اہلِ سندھ کے بظاہر سادہ اور دیہاتی طور طریقوں میں مضمر اعلیٰ تہذیبی اقدار کو نہیں دیکھ پائے بلکہ انہوں نے دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن کی تکلف سے مرصّع اور تصنّع سے مزیّن تہذیب ہی کو معیاری گردانتے ہوئے قدیم سندھیوں کو بنظرِ استحقار دیکھا، یہاں تک کہ اُن کا مذاق اڑانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ یہ طرزِ عمل ان میں سے بعض زیادہ مہذّب و مثقف لوگوں کا پنجابیوں کے ساتھ بھی رہا جنہیں وہ ازراہِ تفننِ طبع "پنجابی ڈھگے" کہتے رہے!) ـــــ اسی طرح انہوں نے اپنے 'اہلِ زبان' ہونے کے گھمنڈ میں سندھی زبان و ادب کی جانب کوئی توجہ نہیں کی ـــــ اور اگرچہ اندرونِ سندھ مہاجرین کی نئی نسل اب سندھی زبان میں بلا تکلف گفتگو کر لیتی ہے لیکن ظاہر ہے کہ عام بول چال کی زبان کا استعمال اور شے ہے اور کسی زبان کے اعلیٰ ادب کا ذوق پیدا ہونا اور اس میں علمی و ادبی تحریر و تقریر پر قادر ہونا بالکل دوسری بات ہے ـــــ بہرحال اس کا ردِّ عمل مقامی سندھی آبادی میں شدّت کے ساتھ پیدا ہوا، اور یہی وہ چیز تھی جس کا سندھ کے ہندو مدّت سے گھات لگائے انتظار کر رہے تھے ـــــ چنانچہ انہوں نے اس صورتِ حال سے بھرپور فائدہ اٹھایا ـــــ اور اس معاملے میں انہیں کوئی 'دوش' بھی نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے کہ انہوں نے 'بھارت ماتا' کی تقسیم اور

اسلام کے نام پر بننے والے ملک پاکستان کو، ظاہر ہے کہ، مجبوراً ہی گوارا کیا تھا۔ اور ان سے یہ توقع کوئی عقل و خرد سے بالکل عاری انسان ہی کر سکتا ہے کہ وہ پاکستان کو ذہنی یا قلبی طور پر قبول کر سکتے ہیں ـــــ لہٰذا مشرقی پاکستان کی تاریخ سندھ میں بھی دہرائی گئی۔ اور وہاں تو بنگلہ زبان و ادب کی راہ سے صرف 'مسلم قومیت'، یا دو قومی نظریے ہی پر ضرب لگائی گئی تھی جس سے پاکستان کے دولخت ہونے کی راہ ہموار ہوئی، یہاں اس سے بھی آگے بڑھ کر 'نظریۂ پاکستان'، اور اسلام کے اساسی عقائد و نظریات پر وار کیا گیا جس کے نتائج آج روزِ روشن کے مانند نگاہوں کے سامنے موجود ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے قدر سے نظری و نفسیاتی معاملے کے ساتھ ساتھ زبان کے مسئلے کا ایک خالص مادّی اور مالیاتی پہلو بھی ہے ـــــ اور وہ یہ کہ دنیوی ترقی اور مسابقت کی دوڑ میں، ظاہر بات ہے کہ، وہ لوگ ہمیشہ آگے رہتے ہیں جو اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہوں، بہ نسبت ان کے جنہیں کسی غیر مادری یا اجنبی زبان میں تعلیم حاصل کرنی پڑے۔ چنانچہ سندھیوں نے بالکل بجا طور پر محسوس کیا کہ اوّل تو وہ اس طویل تاریخی پس منظر کی بنیاد پر جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ویسے ہی تعلیم کے میدان میں پسماندہ ہیں، اب اگر مستقل طور پر اردو ہی ذریعۂ تعلیم بن گئی تو سندھی نوجوان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اردو بولنے والوں سے پیچھے رہ جائیں گے ـــــ یہی وجہ ہے کہ سندھ میں 'احساسِ محرومی' سب سے پہلے نوجوان طلبہ ہی میں پیدا ہوا۔ اور خاص طور پر جب ۱۹۵۸ء میں جنرل محمد ایوب خاں کے پہلے مارشل لاء کے دوران سندھی طلبہ کو 'حکماً' اردو پڑھنے پر مجبور کیا گیا تو سندھ کی نوجوان نسل میں شدید ناراضگی کی لہر دوڑ گئی جس نے رفتہ رفتہ غم و غصّے کے طوفان کی صورت اختیار کر لی۔

الغرض! یہ ہے پاکستان میں عمومی سیاسی استبداد اور معاشی استحصال سے پیدا شدہ ملک گیر احساسِ محرومی پر مستزاد سندھ کی قدیم آبادی کی اضافی ناراضگی اور بے چینی و بے اطمینانی کا پس منظر جس نے اس 'جدید سندھی نیشنلزم'، کو دو نہایت قوی لیکن منفی عوامل مہیّا کر دیئے ہیں جس نے پاکستان کی سالمیت کے لئے چیلنج کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور 'جابائے سندھ'، مسٹر جی ایم سیّد کے قول کے مطابق پاکستان کی تاریخ کے طویل ترین

مارشل لاء نے، جس کے باقیات السیئات، تاحال برقرار ہیں، اسے اتنی تقویت بخش دی ہے کہ اب کھلم کھلا پاکستان کو توڑ دینے اور بھارت کے ساتھ کنفیڈریشن کی باتیں ہونے لگی ہیں، ـــــ اور واقعہ یہ ہے کہ بظاہر احوال یہی نظر آتا ہے کہ اللہ کی کوئی خصوصی مشیّت اور کوئی خاص خدائی تدبیر ہی پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھ سکتی ہے ـــــ اور اس پر بہرحال ہمارا پختہ ایمان ہے کہ اللہ " فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ " (سورۂ بروج : " جو ارادہ فرمالے اُسے بہرصورت پورا کرنے والا ! ") بھی ہے اور " غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ " (سورۂ یوسف، آیت ۲۱ : " اپنے کام پر پوری قدرت رکھنے والا ! ") بھی، اگرچہ اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے !! (وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ) ۔

مہاجرین کا ردِّ عمل

ہندوستان " دو قومی نظریہ " کی بنیاد پر تقسیم ہوا تھا اور پاکستان کا قیام " مسلم قومیت " کی اساس پر عمل میں آیا تھا ـــ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ یہ قائد اعظم محمد علی جناح کا عظیم کارنامہ تھا کہ انہوں نے اس دَور میں جبکہ الحاد اور مادہ پرستی کو پورے کرۂ ارضی پر فیصلہ کن غلبہ حاصل ہے اور لادینیت اور وطنی قومیت سیاسیات کے " مسلّمات " میں سے ہیں اپنی خداداد ذہانت و قابلیت اور بے پناہ محنت و مشقت کے بل پر یہ حقیقت منوالی کہ " قومیت کی ہر تعریف کی رُو سے ہندوستان کے مسلمان ایک قوم ہیں ! " قائد اعظم مرحوم کے اس کارنامے کی عظمت کا صحیح انکشاف اس وقت ہوتا ہے جب یہ حقیقت پیشِ نظر ہو کہ آج کل تو پھر بھی پوری دنیا میں بالعموم اور عالم اسلام میں بالخصوص مذہب کا کچھ نہ کچھ چرچا موجود ہے لیکن آج سے نصف صدی قبل تو صورتِ حال بالکل حضرت اکبر کے اس شعر کے مطابق تھی کہ ؎

" رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ۔ کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں ! "

پھر اگرچہ تحریک پاکستان کا اصل جذبۂ محرکہ مذہبی نہیں تھا بلکہ صرف یہ " خوف " تھا کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ انصاف اور برابری کا سلوک نہیں کریں گے بلکہ اپنی عددی فوقیت کے بل

پر ان کے حقوق غصب کریں گے اور یہ بھی بعید نہیں کہ ان سے (شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں) اپنی ہزار سالہ شکست کا انتقام لیں ـــــ لیکن چونکہ مسلم قومیت کی اساس نہ نسل پر تھی نہ زبان پر بلکہ صرف اور صرف اسلام پر تھی لہٰذا جیسے جیسے قومی تحریک نے قوت پکڑی، مذہبی جوش و خروش بھی، کم از کم زبانی کلامی حد تک، بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ تقسیم ہند سے متصلاً قبل پورے برِ عظیم کا طول و عرض ان نعروں سے گونج اٹھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ!" اور "پاکستان کا مطلب کیا؟ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ!" ـــــ نتیجتہً اس جذباتی اور ہیجانی فضا میں زمینی و جغرافیائی، تہذیبی و ثقافتی اور نسلی و لسانی، الغرض جملہ 'مادّی' حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ـــــ بلکہ اگر کسی نے ان کی جانب توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی بھی تو اسے بلا توقف غدار اور "ہندو کا زر خرید ایجنٹ" قرار دے دیا گیا۔

بنا بریں قیامِ پاکستان سے متصلاً قبل اور اس کے بعد بھی کچھ عرصے تک کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پاکستان میں مسلم قومیت کا جذبہ ـــ "طبیعت کوئی دم میں بھر جائے گی۔ چڑھی ہے یہ آندھی اتر جائے گی" کے مصداق اس قدر جلد سرد پڑ جائے گا اور نسلی اور لسانی عصبیتیں اتنی سُرعت سے سر اٹھالیں گی ـــــ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اگر پاکستان واقعتہً اسلام کا گہوارہ اور قائدِ اعظم کے قول کے مطابق "اسلام کے اصولِ حریّت و اخوّت و مساوات" کا نمونہ بن جاتا۔ اور ملّت کا قافلہ اُس سمت میں رواں ہو جاتا جس سے گاندھی جی سب سے زیادہ خائف تھے یعنی "پان اسلام ازم" یا عالمی ملّتِ اسلامی کی نشأۃِ ثانیہ، تو پاکستان میں نسلی و لسانی اور صوبائی و علاقائی عصبیتیں ہرگز پروان نہ چڑھ سکتیں۔

لیکن افسوس کہ ہم من حیث القوم آزادی کے مادّی فوائد کو سمیٹنے میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ نہ اپنے مقصد کا دھیان رہا نہ منزل کی فکر ـــــ اور ستم بالائے ستم یہ کہ پاکستان کی سول بیوروکریسی اور ملٹری لیڈر شپ نے سیاسی عمل کو مسلسل روکے رکھا۔ چنانچہ یہاں نہ کُل پاکستان بنیاد پر کوئی مضبوط سیاسی جماعت وجود میں آسکی، نہ سیاسی روایات مستحکم ہو سکیں، نہ ہی سیاسی ادارے پروان چڑھ سکے ـــــ کہ نئے رجحانات کو جمہوری و دستوری خطوط پر ڈالا جا سکتا اور نظریاتی جوش و خروش کے ٹھنڈے پڑنے سے جو 'زمینی حقائق' منظرِ عام

پر آئے اور انہوں نے جن نئے مسائل کو جنم دیا انہیں خوش اسلوبی سے حل کیا جاسکتا۔ نتیجتہً پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ 'دھماکوں' کی داستان بن کر رہ گئی!

اس سلسلے کا اوّلین اور عظیم ترین دھماکہ مشرقی پاکستان میں ہوا اور وہاں ایک لسانی عصبیت نے باضابطہ 'قومیت' کی شکل اختیار کر کے نہ صرف یہ کہ پاکستان کو دولخت کر دیا بلکہ مشرقی پاکستان کو 'بنگلہ دیش' میں تبدیل کر کے گویا 'مسلم قومیت' کی علی الاعلان نفی کر دی۔ اس ضمن میں یہ حقیقت پیش نظر رہنی ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان میں زبان کا مسئلہ قیام پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم مرحوم کی زندگی ہی میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس میں ایک تو تعجب اور عبرت کا سامان ہے کہ "کجا آں شورا شوری، کجا ایں بے نمکی!" کے مصداق کہاں تو مسلم بنگال میں مسلم قومیت کے جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ۱۹۴۶ء میں وہاں کی مسلم لیگی قیادت نے اصرار کر کے ۱۹۴۰ء کی قرار داد پاکستان میں ترمیم کرائی اور مجوزہ پاکستان کے لئے 'ریاستوں' کی بجائے 'ریاست' کا لفظ طے کرایا ـــــــ کجا یہ حال کہ ۱۹۴۸ء ہی میں زبان کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا جس کے لئے خود قائداعظم مرحوم کو اپنی ضعیفی اور علالت کے باوجود بنفس نفیس مشرقی پاکستان کا سفر کرنا پڑا۔ اور دوسرے یہ سبق مضمر ہے کہ زمینی حقائق کو نظر انداز کرنے اور حقیقی و واقعی مسائل سے مسلسل صرف نظر کرنے کے نتائج بہت خوفناک ہو سکتے ہیں ـــــ اس لئے کہ قدرت نے ہمیں ۱۹۴۸ء سے ۱۹۷۱ء تک لگ بھگ ربع صدی کی مہلت دی لیکن ہم نے مسائل کو حل کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک انتہائی رسوا کن شکست اور عبرت ناک ہزیمت کا کلنک کا ٹیکہ نہ صرف ہماری بلکہ پوری عالمی ملت اسلامیہ کی پیشانی پر لگ گیا۔

مغربی پاکستان کے صوبہ سندھ میں بھی زبان کے مسئلہ پر بے چینی کے آثار قیام پاکستان کے فوراً بعد ظاہر ہو گئے تھے۔ اور یہاں بھی لسانی عصبیت کی آگ اندر ہی اندر سلگنی شروع ہو گئی تھی لیکن افسوس کہ اس کے ضمن میں بھی ہم تغافل ہی کی روش پر قائم رہے۔ مشرقی پاکستان کے ضمن میں تو یہ عذر بھی پیش کیا جا سکتا تھا کہ وہ ہم سے دور تھا اور ذرائع آمد و رفت نہ اتنے آسان تھے نہ اتنے سستے کہ عام لوگ ادھر اُدھر آجا سکتے اور ایک دوسرے کے حالات سے

واقفیت حاصل کی جاسکتی لیکن سندھ تو ناک تلے کا معاملہ تھا۔ اس کے ضمن میں تو ہم اپنی اجتماعی بے بصیرتی کے سوا اور کسی چیز کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ سندھی نیشنلزم کی آگ اندر ہی اندر پھیلتی رہی اور اس کا دائرہ اثر و نفوذ تیزی سے بڑھتا رہا اور پوری قوم ؎ "تم سنوارا کرو بیٹھے ہوئے گیسو اپنا!" کی تصویر بنی رہی۔

لیکن ؎ "فطرت لہو ترنگ ہے غافل، نہ جل ترنگ!" کے مصداق قدرت کا قانون تو خاموش تماشائی نہیں بنا بیٹھا رہ سکتا تھا ـــــ اور نیوٹن کے بیان کردہ قوانینِ حرکت کے مطابق "ہر عمل کا ایک ردِ عمل ہوتا ہے جو قوت و شدت میں اس عمل کے مساوی لیکن سمت اور رُخ کے اعتبار سے متضاد ہوتا ہے!" ـــــ چنانچہ جیسے جیسے سندھ میں سندھی نیشنلزم نے زور پکڑا، سندھ میں آباد جملہ غیر سندھی لوگوں میں بالعموم اور اردو بولنے والے مہاجرین، میں بالخصوص ردِ عمل کا ظہور بھی شروع ہوگیا۔ جو ابتداءً صرف ایک موہوم سی بے چینی اور بے اطمینانی کی صورت میں تھا۔ پھر اس میں مایوسی اور خوف کے منفی احساسات پیدا ہوئے، جن کا عملی ظہور متعدد مراحل سے گزر کر اور "طبقاً عن طبقٍ" ترقی کرتا ہوا آج اتنی خوفناک اور مہیب صورت اختیار کر چکا ہے کہ علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"اس کی بربادی پہ آج آمادہ ہے وہ کارساز؟؟؟
جس نے اس کا نام رکھا تھا جہانِ کاف و نون!"

بالکل ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے پاکستان کی سالمیت پر آخری اور سب سے کاری ضرب لگانے کے لئے ان ہی لوگوں کی نوجوان نسل نے کمر کس لی ہے جو اس عالمِ اسباب میں اس کے قیام کے کریڈٹ کے سب سے بڑے دعویدار تھے ؎ "کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!"

پہلا مرحلہ: بیرونِ مُلک فرار

اس ردِ عمل کے پہلے مرحلے کو غیر شعوری پسپائی یا خاموش فرار یا بائبل کی اصطلاح میں "خروج" (EXODUS) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے یعنی جب اولاً پاکستان کا دارالخلافہ

کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا گیا ـــــ اور ثانیاً مہاجرین کی نوجوان نسل کے کانوں میں "فرزندانِ زمین" (SONS OF THE SOIL) کے قبیل کے الفاظ بار بار پڑنے لگے اور انہوں نے محسوس کیا کہ خود وہ اس زُمرے سے خارج ہیں۔ مزید برآں، یہ صدا بھی پیہم سنائی دینے لگی کہ "پاکستان میں چار قومیتیں آباد ہیں: پنجابی، سندھی، پٹھان، اور بلوچ" اور اس فہرست میں بھی انہیں اپنا کوئی ذکر نہیں ملا تو انہیں بالکل اس کیفیت کا سا احساس ہونے لگا جو حضرت مسیحؑ کے ان الفاظ میں جھلکتی ہے کہ "پرندوں کے لئے گھونسلے ہیں، اور جانوروں کے لئے بھٹ، لیکن ابنِ آدم کے لئے سر چھپانے کی کوئی جگہ نہیں ہے!" اور انہیں شدّت کے ساتھ محسوس ہوا کہ وہ پاکستان کی سرزمین میں "ناپسندیدہ عنصر" نہیں تو کم از کم "بن بلائے مہمان" کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں اور پاکستان فی الواقع ان کا وطن نہیں ہے! ـــــ اور ان زبانی کلامی باتوں پر مستزاد جب سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے ضمن میں "کوٹہ سسٹم" اور دیہی اور شہری کی تقسیم نے ان پر بالفعل معیشت کا دائرہ تنگ اور ترقّی کی راہیں مسدود کرنی شروع کر دیں تو مہاجرین کی نئی نسل نے پاکستان میں اپنے مستقبل سے مایوس ہو کر باہر کا رُخ کیا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نے وطن کو خیرباد کہہ کر دیارِ غیر میں جا ڈیرہ لگایا۔ چنانچہ اب خصوصاً کراچی میں ایک بڑی تعداد ایسے مہاجر خاندانوں کی ہے جن کی پوری نوجوان نسل ملک سے باہر جا چکی ہے اور یورپ اور امریکہ کے مختلف ممالک میں مستقل سکونت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں تک کہ کراچی میں بہت سے بڑے بڑے مکانوں اور عالیشان کوٹھیوں میں اب صرف بوڑھے والدین رہتے ہیں یا، جب وہ بھی کسی بیٹے یا بیٹی کے پاس گئے ہوتے ہیں تو، صرف مالی اور چوکیدار!

ہو سکتا ہے کہ بعض لوگوں کے سامنے اس معاملے کا یہ روشن پہلو ہو کہ ان باہر جانیوالوں کے ارسال کردہ زرِ مبادلہ سے ملکی معیشت کو سہارا ملا اور اس طرح ملک و ملت کو فائدہ پہنچا لیکن اگر ذرا دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ اس میں ایک بہت بڑا مغالطہ مضمر ہے ـــــ اس لئے کہ اوّل تو یہ زرِ مبادلہ اُن اعلیٰ تعلیمیافتہ لوگوں کے ذریعے آیا ہی نہیں جو مختلف مغربی ممالک کی شہریت اختیار کر کے وہاں مستقلاً آباد (SETTLE)

ہو گئے ہیں بلکہ اس کا اکثر وبیشتر حصّہ ان مزدوروں اور کاریگروں کی محنت و مشقت کا حاصل ہے جو خالص عارضی طور پر باہر گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے خون پسینے کی کمائی وطن بھیج رہے ہیں تاکہ واپسی پر بہتر زندگی گذار سکیں ــــــ ثانیاً اگر اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کی ملک بدری سے کوئی مالی فائدہ ہوا ہو تب بھی علّامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"دیں ہاتھ سے دیکر اگر آزاد ہو ملّت ! ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا!"

یہ بڑے گھاٹے اور خسارے کا سودا ہے۔ اس لئے کہ اس تلخ ترین حقیقت سے قطع نظر کہ دیارِ مغرب میں مستقل طور پر آباد ہونے والوں کی آئندہ نسل کی عظیم اکثریت کے بارے میں شدید خطرہ ہے کہ وہ اپنے دین و مذہب ہی نہیں، اپنی ثقافت و معاشرت حتّٰی کہ ملّی غیرت و حمیت سے محروم ہو کر مغرب کی بے خدا تہذیب اور مادر پدر آزاد معاشرت میں گم ہو جائے گی، خود پاکستان کے مستقبل کے اعتبار سے قابلیت و مہارت کا یہ نقصان (TALENT LOSS) اور ذہانت و فطانت سے یہ محرومی (BRAIN DRAIN) مُضر ہی نہیں مہلک ہے! اور کم از کم ان سطور کے راقم کو تو اس صورتِ حال میں بجر "قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند!" کی سی کیفیت کا احساس ہوتا ہے! ــــــ اور جب ذاتی احساس کی بات آ ہی گئی تو یہ عرض کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ راقم کے لئے اس معاملے کا سب سے زیادہ دردناک اور تکلیف دِہ پہلو یہ ہے کہ پاکستان سے مستقلاً باہر چلے جانے والے ان تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک کثیر تعداد اُن کی بھی ہے جو اپنی جوانی کے دَور میں مختلف دینی تحریکوں کے زیرِ اثر آنے کے باعث احیائے دین و ملّت کے جذبے سے سرشار ہو گئے تھے۔ اور اگر یہ پوری قوت ملک میں موجود رہتی تو کم از کم بظاہر احوال یہی نظر آتا ہے کہ پاکستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی تعمیر بھی زیادہ مستحکم بنیادوں پر ہوتی اور یہاں اسلامی انقلاب کے امکانات بھی کہیں زیادہ روشن ہوتے ــــــ واللہ اعلم!

اس ضمن میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگرچہ غیر ممالک میں مستقلاً آباد ہو جانے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکستانیوں میں مہاجرین کے ساتھ ساتھ ایک بڑی تعداد پنجابیوں اور قدرِ قلیل مقدار پٹھانوں کی بھی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک و ملّت کی تعمیر و ترقی

اور قوم کی عمومی خوشحالی اور عوامی بہبود کے نقطۂ نظر سے ان سب ہی کی صلاحیتوں سے محرومی عظیم زیاں کاری ہے ــــــ لیکن مہاجرین کا معاملہ کئی اعتبارات سے مختلف بھی ہے اور اہم تر بھی! مثلاً ایک اس اعتبار سے کہ ان کی نوجوان اعلیٰ تعلیم یافتہ نسل کا یہ 'خروج' بہت بڑے پیمانے (MASS SCALE) پر ہوا ــــــ دوسرے یہ کہ ان کی اکثریت کی وطن سے ہجرت کا اصل سبب یہ "ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!" کے مصداق اعلیٰ سے اعلیٰ تر کی تلاش نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ وطن میں اپنا مستقبل انہیں بالکل ہی تاریک نظر آرہا تھا ــــــ اور آخری لیکن اہم ترین بات یہ کہ چونکہ وہ خود یا اُن کے والدین بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے لہٰذا ان میں خواہ شعوری سطح پر دین کے فہم و ادراک میں کمی رہی ہو، اور عملی سطح پر ٹھیٹھ دینی اخلاق و کردار بھی وافر مقدار میں موجود نہ ہوں، کم از کم جذبۂ ملی بدرجۂ اتم موجود تھا اور اُمتِ مسلمہ کی عظمت و سطوتِ گذشتہ کی بازیافت کی شدید خواہش بہرحال موجود تھی ــــــ اور آج پاکستان کے استحکام ہی نہیں، وجود و بقا تک کو سب سے بڑا خطرہ اسی جذبے اور آرزو کے فقدان سے لاحق ہے! ــــــ اور اگر دل کے کان بند نہ ہوں تو ہر حسّاس و مخلص پاکستانی مسلمان کو جذبۂ ملی سے سرشار اور ملّتِ اسلامی کی نشأۃ ثانیہ کی آرزو مند اس نوجوان قوت کے وطن سے فرار پر علامہ اقبال کی رُوح یہ فریاد کرتی سنائی دے گی کہ ؎

"آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر ــ ڈھونڈ اب ان کو چراغِ رُخِ زیبا لے کر!"

اور ؎ میں کہ میری نوا میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ ــ میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو!"

دوسرا مرحلہ: پنجابیوں اور پٹھانوں کے ساتھ دفاعی اتحاد

ملک سے باہر چلے جانے والوں کا معاملہ جذباتی اور نفسیاتی نقطۂ نظر اور ملک و ملت کے مستقبل کے اعتبار سے نہایت اہم ہونے کے باوجود، ظاہر ہے کہ، مقدار اور کمیت کے اعتبار سے اتنا مؤثر نہیں تھا کہ اندرونِ ملک ردِّ عمل کی مزید پیش رفت کے لئے رکاوٹ بن سکتا۔ اس لئے کہ اوّل تو باہر جانے والے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے، نسبتاً کم تر

علمی صلاحیتوں کے حامل لوگوں کے لئے باہر کا راستہ بہت بعد میں کھلا (اور وہ بھی امریکہ وغیرہ میں نہیں بلکہ اکثر و بیشتر صرف سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں میں، جہاں کا معاملہ خالص عارضی ہے!) ـــــ پھر جیسے جیسے وقت گذرا یورپ اور امریکہ وغیرہ کی ضروریات بھی پوری ہوتی چلی گئیں اور اس طرح گویا دنیا کی "انسانی منڈیوں" میں "مانگ" کم ہوتی گئی اور بیرونِ ملک امکانات بھی روشن نہ رہے تو ملک کے اندر رہتے ہوئے اپنے مستقبل کے تحفظ کی فکر لاحق ہوئی ـــــ اور اس طرح عملی جوابی کارروائی کا آغاز ہوا، جسے اس ردِ عمل کا دوسرا مرحلہ قرار دیا جا سکتا ہے!

اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر مسٹر جی ایم سیّد کے قائم کردہ "سندھ متحدہ محاذ" کے مقابلے میں "سندھ کراچی مہاجر پنجابی پٹھان متحدہ محاذ" کا قیام عمل میں آیا جس کے بانی و مؤسس اور روحِ رواں نواب مظفر حسین خاں مرحوم تھے۔ جس نے پہلی بار کھلے الفاظ میں سندھی نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے اور سندھ میں آباد دوسری قومیتوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کی۔ یہ محاذ اوائل اکتوبر ۱۹۶۹ء میں حیدر آباد سندھ میں منعقدہ کنونشن میں قائم ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ "محاذ کی رکنیت ہر اس بالغ مرد اور عورت کو دی جائے گی جسے مسٹر جی ایم سیّد کے جدید فلسفۂ قومیت کے اصول پر غیر سندھی یا نیا سندھی پکارا جاتا ہے" ـــــ روزنامہ نوائے وقت کے سیاسی مبصر جناب محمد علی کے مضمون کے مطابق:

"کنونشن کے ابتدائی اجلاس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں تھیں ان میں کہا گیا تھا کہ ان اعلیٰ افسران کے خلاف سخت تادیبی کارروائی کی جائے جو نظریۂ پاکستان اور اسلام سے انحراف کر کے تعصب و عصبیت کی بنیاد پر کاروبارِ زندگی چلا رہے ہیں۔ بھارت میں فسادات سے متاثرہ افراد کے لئے پاکستانی سرحد کھولی جائے اور بھارتی حکومت کے مسلمان دشمن طرزِ عمل کی مذمت کی جائے۔ صوبائی و لسانی تعصب کا خاتمہ کیا جائے۔ سندھ کے آبادکاروں کی زبردستی بے دخلی روکی جائے۔ پنجابی آبادکاروں کو قانون کا تحفظ فراہم کیا جائے ان ہندوؤں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے جو تقسیم کے وقت

بھارت چلے گئے تھے۔ لیکن اب واپس آکر مسلمانوں کی املاک پر قبضہ کر رہے ہیں۔ کوٹہ سسٹم ختم کیا جائے۔ فنی تعلیمی اداروں میں اہلیت و قابلیت کے اصول پر عمل کیا جائے۔ مارشل لاء ریگولیشن ۸۴، ۸۹، ۹۱ کی تنسیخ کی جائے۔"

نتیجہ: خونی تصادم

اندرونِ سندھ اس وقت تک جو فضا تیار ہو چکی تھی اس کے پیشِ نظر یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ قدیم سندھیوں نے اس محاذ کے قیام اور اس کی مندرجہ بالا قرار داد کو اپنے خلاف 'اعلانِ جنگ' سمجھا اور اس طرح جو آگ اب تک اندر ہی اندر سُلگ رہی تھی اُس کے بھڑک اُٹھنے اور منظرِ عام پر آجانے کا وقت آگیا۔ چنانچہ اوّلاً ۲۶ جنوری ۷۰ء ہی کو (گویا محاذ کے قیام کے چار پانچ ماہ کے اندر اندر) حیدر آباد میں مہاجر اور سندھی طلبہ کے مابین خوں ریز تصادم ہوا اور اس کے کُل دو ہی سال بعد ۱۹۷۲ء میں سندھ کے طول و عرض میں 'لسانی فسادات' کا دھماکہ ہو گیا۔

۷۲ء کے ان لسانی فسادات کی وسعت اور تیزی و تُندی سے قطع نظر اوّلاً یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ یہ ۷۱ء کے سقوطِ مشرقی پاکستان کے حادثۂ فاجعہ کے فوراً بعد ہوئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں رُوح فرسا واقعات کا تعلق کسی ایک ہی بین الاقوامی سازش سے تھا ـــــ ثانیاً اس بظاہر خالص اندرونی معاملے اور داخلی مسئلے کے ڈانڈے کس طرح سندھی ہندوؤں کی وساطت سے بھارت کے ساتھ ملے ہوئے تھے اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے جو "نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں" کے مصداق مشرقی پاکستان کی 'فتح' کے نشے میں بدمست ہونے کے باعث آنجہانی اندرا گاندھی کی زبان سے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے نکل گئے تھے کہ "میں بہت جلد آپ لوگوں کو ایک اور بہت بڑی خوشخبری بھی سنانے والی ہوں!" ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیّت میں ابھی ہمارے لئے مزید مہلت مقدر تھی اور عذاب کے یہ کوڑے دراصل اس سُنّتِ الٰہی کا مظہر تھے جو سورۂ سجدہ کی آیت ۲۱ میں

بدیں الفاظ وارد ہوئی ہے ـــ " وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○ " یعنی "ہم انہیں اپنے آخری اور بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے عذاب کا مزہ چکھائیں گے، شاید کہ یہ اپنی روش سے باز آجائیں" ـــ لہٰذا ملک وملّت کے دشمنوں کی دلی آرزوئیں پوری نہ ہو سکیں اور پاکستان کا نام صفحۂ ہستی سے بالکلیہ نہ مٹایا جا سکا!

واضح رہے کہ ارادۂ خداوندی سے قطعِ نظر، عالمِ اسباب میں اس کے تین نمایاں سبب تھے: ایک یہ کہ امریکہ میں اس وقت عارضی طور پر صدر نکسن برسرِ اقتدار تھے جن کے پاکستان کی جانب جھکاؤ (PRO-PAKISTAN TILT) کا آنجہانی اندرا گاندھی کو عمر بھر گلہ رہا۔ دوسرے یہ کہ پاکستان میں اس وقت مرحوم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت قائم تھی جو خود تو سندھی تھے مگر انہیں سیاسی تائید (SUPPORT) سندھ سے بھی کہیں زیادہ پنجاب سے حاصل تھی اور اس طرح ان کی شخصیت کو اس وقت مغربی پاکستان کے ان دو سب سے بڑے صوبوں کے مابین رابطے (LINK) کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی اور تیسرے یہ کہ سندھی نیشنلزم کے انتہا پسند علمبرداروں سے اس موقع پر ایک اہم غلطی یہ سرزد ہو گئی کہ انہوں نے مہاجروں اور پنجابیوں دونوں کے خلاف اپنی نفرت و عداوت کا اظہار بیک وقت کر دیا اور سندھی انتہا پسندی ابھی اتنی مضبوط اور توانا نہ تھی کہ بیک وقت دونوں محاذوں پر مقابلہ کر سکتی!

بھٹو دَور کی نظریاتی محاذ آرائی

اس وقت، ظاہر ہے کہ، نہ مسٹر بھٹو کے ذاتی محاسن و معائب کا جائزہ لینا پیشِ نظر ہے، نہ ان کے پانچ سالہ دورِ حکومت کا تفصیلی میزانیۂ نفع و نقصان مرتب کرنا مطلوب ہے، البتہ موضوعِ زیرِ بحث کے اعتبار سے اس حقیقت کی جانب اشارہ ضروری ہے کہ اس دَور کے آغاز واختتام، دونوں مواقع پر ملک میں نظریاتی تقسیم اور اس سے پیدا شدہ افقی محاذ آرائی (HORIZONTAL POLARISATION) اتنی شدت کے ساتھ پیدا ہوئی کہ اس کے نتیجے

میں علاقائی اور نسلی و لسانی اختلافات اور اُن سے پیدا ہونے والی عمودی تقسیم ـــــ (VERTICAL POLARISATION) کسی قدر پس منظر میں چلی گئی۔ چنانچہ اس دَور کا آغاز بھی دائیں اور بائیں بازو کے پُرزور تصادم اور 'اسلام' اور 'سوشلزم' کے مابین دھواں دھار جنگ سے ہوا تھا (اگرچہ اس تصادم اور جنگ کی حیثیت زیادہ تر صرف کاغذی اور ہوائی تھی!) اور اس کا اختتام بھی پاکستان قومی اتحاد (P.N.A.) کی اُس تحریک کے ذریعے ہوا جو اگرچہ ابتداء میں تو خالص سیاسی نوعیت کی تھی لیکن بعد میں رفتہ رفتہ تحریک نظامِ مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صورت اختیار کر گئی۔ چنانچہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ اس کے دوران تحریکِ پاکستان کے آخری اور فیصلہ کُن ایّام کی کیفیات عود کر آئی تھیں اور صرف قومی و ملّی ہی نہیں، دینی اور مذہبی جوش و خروش بھی ایک بار پھر نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں علاقائی اور لسانی عصبیتوں کا معاملہ لامحالہ پس منظر میں چلا گیا، یہاں تک کہ بالکل ایسے جیسے تحریکِ خلافت کے عروج کے دوران گاندھی ایسے ہندو 'مہاتما' کو اس میں شمولیت اختیار کرنی پڑی تھی، سندھی نیشنلزم کے 'گورو' یعنی مسٹر جی ایم سیّد کو بھی، خواہ دبی زبان ہی سے سہی، پاکستان قومی اتحاد کی تحریک کی تائید کرنی پڑی۔

اس نظریاتی تصادم کے اثرات کے علاوہ چونکہ بھٹو دَور میں پاکستان میں ایک طویل عرصے کے بعد پہلی مرتبہ 'عوامی سیاست' کی گہما گہمی پیدا ہوئی تھی اور عوام میں خواہ صحیح خواہ غلط، یہ احساس ضرور پیدا ہوا تھا کہ اب ہمارے معاملات ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہیں (اور یہ احساس بجائے خود بہت تسکین بخش ہوتا ہے!) لہٰذا اس دَور میں سیاسی محرومی کے اس عمومی احساس میں بھی کمی پیدا ہوئی جسے سندھ میں خصوصی شدّت کے ساتھ محسوس کیا گیا تھا ـــــ اور ان سب پر 'مستزاد' اس واقعے نے بھی سندھ کے خصوصی احساسِ محرومی میں بہت کمی کر دی تھی، بلکہ اہلِ سندھ کے زخموں پر مرہم کا کام کیا تھا، کہ اب پاکستان کی مرکزی حکومت کے سنگھاسن پر ایک سندھی براجمان ہے!

اِن جُملہ عوامل کے باوجود اُس دَور میں بھی سندھی نیشنلزم کا جذبہ بالکل سرد نہیں

پڑا تھا بلکہ "آگ بجھی ہوئی نہ جان، آگ دبی ہوئی سمجھ!" کے مصداق اُس نے دوبارہ صرف اندر ہی اندر سُلگنے والی آگ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خود بھٹو صاحب کو سندھی نوجوانوں کی جذباتی کیفیت کے پیشِ نظر "کوٹہ سسٹم" کو دس سال تک کے لئے دستوری تحفظ فراہم کرنا پڑا۔ مزید برآں ـــــ کُل پاکستان سطح پر "قائدِ عوام" کی حیثیت تو صرف ذوالفقار علی بھٹو کو حاصل ہوئی تھی، اُن کے دوسرے سندھی رفقاء اور اعزّہ و اقارب کو تو بہرحال اپنی سیاست کی بساط سندھ ہی کی اساس پر بچھانی تھی۔ لہٰذا انہوں نے بھی درپردہ سندھی نیشنلزم کی حمایت کی۔ چنانچہ اس دَور میں بھی انتہا پسند سندھی قوم پرستی کا لاوا اندر ہی اندر کھولتا رہا اور اس کی سوزش اور جلن جملہ "نئے سندھیوں" اور خاص طور پر اردو بولنے والے مہاجرین کی نوجوان نسل کو محسوس ہوتی رہی۔ نتیجتہً جوابی ردِّ عمل کا مواد بھی اندر ہی اندر پکتا رہا ـــــ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ۱۹۷۷ء کے عام انتخابات میں دھاندلی کے خلاف جو "دھماکہ خیز" تحریک سندھ کے تمام شہروں اور خاص طور پر کراچی میں شروع ہوئی تھی اس کے اسباب و عوامل میں نئے سندھیوں اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے اس ردِّ عمل کو فیصلہ کُن دخل حاصل نہ تھا!

جنرل ضیاء الحق
کا دورِ حکومت اور موجودہ صورتِ حال

جنرل محمد ضیاء الحق بالقابہٖ کا نو سالہ دورِ حکومت اِس داستان کا المناک ترین باب ہے چنانچہ اِس عرصے کے دوران وہ جملہ کیفیات جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے اپنے آخری نقطۂ عروج کو پہنچ گئیں۔

اِس عہد کے ابتدائی پانچ سالوں کے دوران ـــــ ایک طرف تو مارشل لاء کے نفسیاتی رعب کی وجہ سے ملک میں جیل کے "سب اچھا" کا سا سماں بندھا رہا، اور ـــــ دوسری

طرف کچھ نفاذِ شریعت کے دعووں اور شرعی عدالتوں کے قیام، کچھ مذہبی تقریبات کی رونق افروزی اور رؤیتِ ہلال کے شاندار اہتمام اور کچھ علماء کرام کی خاطر مدارات اور مشائخ عظام کے اعزاز و اکرام کی وجہ سے فضا پر مذہبیت کا ظاہری اور سطحی رنگ قائم رہا، مزید برآں جشن استقلال اور یوم اقبال کے قبیل کی 'قومی تقریبات' پر پانی کی طرح پیسہ بہانے سے 'پاکستانیت' کا بھی چرچا رہا ——— اور اس طرح مجموعی طور پر یہ تاثر قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی کہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کی جانب فیصلہ کن مراجعت ہو رہی ہے اور ان کے منافی رجحانات رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں!

لیکن افسوس کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی اور حضرت اکبرؔ کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

"مذہب کی لیپ پوت سے دبتی نہیں ہے عقل   بس عشق ہی مٹاتا ہے اس کی کرید کو!"

اس ظاہری ٹیپ ٹاپ کے پردے میں زیرِ سطح رجحانات (UNDER-CURRENTS) مسلسل قوت پکڑتے اور شدّت اختیار کرتے چلے گئے۔ جن میں دو اگرچہ ملک گیر تھے۔ لیکن ان کی شدّت کا سب سے زیادہ ظہور سندھ میں ہوا اور تیسرا تو تھا ہی خالصتہً (EXCLUSIVELY) سندھ سے متعلق۔

تین منفی نتائج

(۱) مقدّم الذکر ملک گیر اثرات میں سے پہلا یہ کہ مارشل لاء کے نفاذ سے فطری اور منطقی طور پر سیاسی محرومی کا احساس دوبارہ شدّت کے ساتھ پیدا ہو گیا اور اس بار چونکہ فوری تقابل بہت نمایاں تھا کہ کہاں بھٹو دَور کی عوامی سیاست کی گہما گہمی اور کہاں مارشل لاء کا قبرستان کا سا سکوت، لہٰذا اس مرتبہ اُس کا احساس بھی بہت شدّت سے ہوا۔ بالخصوص سندھ میں تو اس نے غالبؔ کے "جوہرِ اندیشہ" کی سی حدّت اختیار کر لی (؎ "عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں۔ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل اٹھا!") اور ریگزارِ سندھ واقعتہً نفرت اور بغاوت

کی آگ میں جلنے لگا! چنانچہ ایک جانب سندھی قوم پرستی تیزی کے ساتھ انتہا پسندی کی طرف بڑھنے لگی اور دوسری جانب ملک وملّت کے کھلے دشمنوں اور اغیار کے ایجنٹوں کو بھرپور موقع مل گیا کہ وہ 'پنجابی فوج' اور 'پنجابی سامراج' کے حوالے سے پنجاب اور اہل پنجاب کے خلاف نفرت وعداوت کی آگ کو پوری شدّت کے ساتھ بھڑکائیں ـــــ اور سندھ کی مظلومیت اور اہلِ سندھ کے حقوق کی دہائی دے کر قدیم سندھیوں کے جذبات کو مشتعل کریں اور بھولے بھالے عوام الناس ہی نہیں بیٹھ دینی مزاج کے حامل لوگوں حتّٰی کہ علماء کرام تک کو 'حقوق کی بازیافت' کے جذبے سے سرشار کر کے بالفعل ایجی ٹیشن کے میدان میں لے آئیں! اور اس جلتی آگ پر تیل ہی نہیں، پٹرول کا کام کیا مسٹر بھٹو کی پھانسی نے ـــــ خصوصاً اس لیے کہ بدقسمتی سے سپریم کورٹ کے جس فیصلے کی رُو سے انہیں یہ سزا ملی وہ متفقہ (UNANIMOUS) نہیں تھا بلکہ کثرتِ رائے پر مبنی تھا، اور ستم بالائے ستم یہ کہ جن چار جج حضرات نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا وہ سب پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اور بقیہ تین جج جنہوں نے انہیں بری کرنے کی رائے دی وہ سب غیر پنجابی تھے۔ نتیجۃً پنجاب کے خلاف اہلِ سندھ کی نفرت میں انتقامی جذبہ بھی شامل ہو گیا۔

مختصر یہ کہ اس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ اندرونِ سندھ بالکل وہ حالات پیدا ہو گئے جو کبھی مشرقی پاکستان میں ہوئے تھے اور جس طرح وہاں بنگالی نیشنلزم کے علمبرداروں کے مقابلے میں محبِّ وطن عناصر بے بس ہو کر رہ گئے تھے اُسی طرح سندھ میں بھی 'سندھو دیش' کے حامیوں کے مقابلے میں پاکستان کی یکجہتی اور سالمیت کے علمبردار غیر مؤثر ہوتے چلے گئے چنانچہ بعینہٖ اس طرح جیسے ایک بار مولوی فرید احمد مرحوم ومغفور کے خلاف ڈھاکہ ائرپورٹ پر ایک مظاہرے میں نعرے لگے تھے کہ "پنجابی دلّال پھیری جاؤ" یعنی "پنجابیوں کے ایجنٹ اور دلّال واپس چلے جاؤ" اُسی طرح کا نقشہ سامنے آتا ہے مسٹر بے نظیر بھٹو کے اس حالیہ بیان میں کہ "اب سندھ میں جو بھی وفاق کی بات کرتا ہے اُسے پنجاب کا ایجنٹ قرار دے دیا جاتا ہے!" ـــــ راقم الحروف کو اس صورتِ حال کا اندازہ ۱۹۸۲ء ہی میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے دسمبر ۱۹۸۲ء میں جنرل ضیاء الحق کے نام خط میں واضح طور پر

لکھ دیا تھا کہ :-

"۔۔۔۔اس ضمن میں اغلباً آپ کے اطمینان کا باعث یہ امر ہے کہ آپ کے خلاف کوئی عوامی تحریک تاحال نہ چل سکی ہے، نہ ہی اس کا کوئی فوری اندیشہ موجود ہے ——— اس سلسلہ میں میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ خدارا اس صورتِ حال سے دھوکا نہ کھایئے۔ اس لیے کہ اس کا اصل سبب بین الاقوامی حالات ہیں جن کے باعث پاکستان کے محبِّ وطن بالخصوص دینی و مذہبی مزاج کے لوگ کوئی 'RISK' لینے کو تیار نہیں ہیں ——— لیکن ایک تو کون نہیں جانتا کہ بین الاقوامی حالات میں کوئی بھی تبدیلی کسی بھی وقت رُونما ہو سکتی ہے اور دوسرے ملک کے بقاو استحکام کے لیے یقیناً بین الاقوامی صورتِ حال بھی کسی قدر اہم ہوتی ہے لیکن اصل اہمیت اس ملک کے اپنے عوام کے اطمینان کی ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں بالخصوص اندرون صوبۂ سندھ جو لاوا پک رہا ہے، مجھے یقین ہے کہ اس کا علم آپ کو بھی لازماً ہوگا۔ لیکن میں اس امکان کو بھی یکسر نظرانداز نہیں کر سکتا کہ بعض اوقات صاحبِ اقتدار لوگوں کے اردگرد جن لوگوں کا حصار قائم ہو جاتا ہے وہ اُسے صحیح صورتِ حال سے مطلع نہیں ہونے دیتے۔ میرے اندازے میں سندھ میں "سندھو دیش" کے لیے میدان پوری طرح اُسی طرح ہموار ہو چکا ہے جیسے مشرقی پاکستان میں "بنگلہ دیش" کے لیے ہوا تھا اور اب فرق صرف یہ ہے کہ چونکہ مشرقی پاکستان ہم سے دُور اور کٹا ہوا تھا، اس لیے مرکزی حکومت وہاں مؤثر کنٹرول نہ کر سکی اور سندھ چونکہ زمینی طور پر ملحق ہے لہٰذا یہاں ایسی کسی بھی تحریک کو بآسانی کچلا جا سکتا ہے لیکن میرے نزدیک اس عامل (FACTOR) پر بہت زیادہ انحصار بھی سخت ناعاقبت اندیشی ہے ۔۔۔۔"

افسوس صد افسوس کہ راقم کے اندیشے صحیح ثابت ہوئے اور اس تحریر کے سات آٹھ

ماہ کے اندر اندر ایم۔ آر۔ ڈی کی تحریک کے ضمن میں سندھ کا آتش فشاں پھٹ گیا اور اتنا زوردار 'دھماکہ' ہوا کہ اچھے اچھے سیاسی مدبر و مبصر بھی حیران رہ گئے! ——— لیکن سورۃ قیامہ کے الفاظ "اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی ثُمَّ اَوْلٰی لَکَ فَاَوْلٰی" کے مصداق مزید افسوس اور پھر مزید افسوس ہے اس پر کہ تاحال نہ سندھ کے اصل مرض کی تشخیص کی جانب کوئی توجہ ہے نہ اُس کے ازالے کی کوئی فکر، بلکہ کل تکیہ اور بھروسہ بالکل المیہ مشرقی پاکستان کے مانند صرف طاقت کی دلیل یا پھر ایک سُپر پاور کی موہوم تائید پر ہے۔

(۲) دوسرا ملک گیر نتیجہ برآمد ہوا اس سے کہ اسلام اور نفاذِ اسلام کا نعرہ جس شد و مد اور جس بلند بانگ انداز میں لگایا گیا اُس کے مقابلے میں حقیقی اور واقعی پیش رفت کا تناسب بالکل نہ ہونے کے برابر رہا اور معاشرہ اور قوم کا حال نہ صرف یہ کہ جُوں کا توں رہا بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہو گیا چنانچہ انفرادی اخلاق و کردار کی پستی بھی بڑھتی چلی گئی، انتظامی ابتری اور امن و امان کی زبوں حالی بھی روز افزوں ہوتی گئی۔ (جس کا نمایاں ترین مظہر یہ کہ خود "مقتدر اعلیٰ" کے قول کے مطابق رشوت پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ گئی) اور اس کے ساتھ ساتھ سماجی ظلم اور معاشی استحصال کی جُملہ صورتیں بھی جُوں کی تُوں برقرار رہیں ——— لہٰذا اسلام دشمن قوتوں کو بھرپور موقع ملا کہ اسلام کو بدنام کریں اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف ریشہ دوانیوں سے بھی آگے بڑھ کر خود 'نظریۂ پاکستان' پر کاری ضرب لگائیں۔ اسلام اور نظامِ اسلامی کے ساتھ تمسخر و استہزاء کے اِس سنہری موقعے سے پورا فائدہ اٹھانے والوں میں غیر مسلموں، کمیونسٹوں اور مارکسسٹوں کے علاوہ وہ مغرب زدہ اور جدیدیت گزیدہ 'لبرل' مسلمان بھی شامل ہو گئے جو یا تو باضابطہ الحاد کا شکار ہو چکے ہیں یا کم از کم نظامِ اجتماعی کی حد تک لادینیت (سیکولرزم) کے قائل ہیں۔ چنانچہ اوّلاً نماز آرڈیننس کا مذاق اڑا، پھر زکوٰۃ اور حدود آرڈیننس کی مٹی پلید ہوئی، پھر نظامِ زکوٰۃ کے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہونے کا چرچا ہوا، آخر میں "نظامِ صلوٰۃ" کی باری آ ہی رہی تھی کہ وہ دورانِ ولادت ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا ——— اِس سلسلے میں بھی راقم کوئی تازہ رائے یا تبصرہ پیش کرنے کی بجائے اپنے اُنہی احساسات کو دوبارہ ریکارڈ پر لانا زیادہ مناسب سمجھتا ہے جن کا اظہار اُس نے ۱۹۸۲ء میں صدر ضیاء الحق

کے نام اپنے متذکرہ بالا خط میں کیا تھا:-

"۔ ۔ ۔ ۔ جہاں تک اِس ملک میں اِسلامی شعائر کی ترویج اور شریعت اسلامی کے نفاذ ـــــ یا بالفاظِ دیگر 'اسلامی نظام' کے قیام کا تعلق ہے اُس کے بارے میں مجھے اِس وقت کچھ عرض نہیں کرنا جس کا اصل سبب میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں، یہ ہے کہ اس معاملے میں مَیں آپ سے قطعاً مایوس ہو چکا ہوں اور عرض و معروض اور گلہ شکوہ وہیں ہوتا ہے جہاں کوئی توقع موجود ہو ۔ ۔ ۔ اِس ضمن میں، جیسا کہ مَیں نے ۲۰ اگست ۸۰ء کو علماء کنونشن میں اپنی تقریر میں عرض کیا تھا، ابتدائی تین سال، جو اِس اعتبار سے نہایت قیمتی تھے کہ "تحریک نظام مصطفیٰ" کا جوش و خروش برقرار تھا اور ملکی فضا میں وہ کیفیت قائم تھی کہ نظامِ اسلامی کے نفاذ کے ضمن میں بڑے سے بڑا اقدام بھی بلا روک ٹوک کیا جا سکتا تھا، تعطّل و تربّص کے نذر کر دیئے گئے۔

پھر جب حدود اور زکوٰۃ آرڈیننس کا اجرا ہوا اور اس پر اہلِ تشیع کی جانب سے جارحانہ ردِّ عمل ظاہر ہوا تو نہ صرف یہ کہ گھٹنے ٹیک دیئے گئے بلکہ ـــــ زیادہ قابلِ افسوس اور اہم تر بات یہ کہ نظامِ زکوٰۃ کے ضمن میں شیعہ اور سُنّی کے مابین تفریق کر کے ضعیف الایمان یا ناواقف سنیوں کے شیعہ بن جانے کا دروازہ کھول دیا گیا ـــــ اِس کے باوجود کہ میں نے ۱۸ اگست ۸۰ء کے مشاورتی اجلاس میں خدا کا واسطہ دے کر عرض کیا تھا کہ اِس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپ زکوٰۃ آرڈیننس پورے کا پورا واپس لے لیں اور زکوٰۃ کی ادائیگی کو حسبِ سابق عوام کا نجی معاملہ قرار دے دیں ـــــ لیکن خدارا اِس میں شیعہ اور سُنّی میں فرق و امتیاز نہ قائم فرمائیے گا۔

اِجتماعیاتِ انسانیہ کے ذیل میں اوّلین معاملہ عائلی اور سماجی نظام کا ہے اور اِس کے ضمن میں ایک طرف عائلی قوانین کو شریعت کورٹ کے دائرۂ کار اور

حدودِ اختیار میں لانے کی جرأت آپ اس لیے نہیں کر پا رہے کہ بعض اعلیٰ طبقات کی بیگمات اور کچھ مغرب زدہ خواتین کی جانب سے ناموافق ردِّعمل کا اندیشہ ہے ——— اور دوسری طرف معاشرہ میں خواتین کے مقام و کردار اور ستر و حجاب یا خود آپ کے الفاظ میں "چادر اور چار دیواری" کے ضمن میں اسلام کے نقطۂ نظر کے بارے میں جو اختلافات گذشتہ دنوں ہمارے ملک میں زور شور سے ظاہر ہوئے، اُس کے بارے میں اگرچہ زبانی تو آپ نے کچھ باتیں ایسی بھی کہیں جو دینی طبقات کے لیے اطمینان بخش تھیں لیکن عملاً اپنا پورا وزن مغرب زدہ اور اباحیت پسند طبقے میں ڈال رکھا ہے۔ (بالخصوص آپ کے حالیہ غیر ملکی دوروں کے دوران آپ کی اہلیہ صاحبہ محترمہ کا یہ طرزِ عمل کہ سر سے چادر بھی اُتر گئی اور نامحرموں سے مصافحہ بھی ہو گیا، از خود فیصلہ کن تھا، لیکن اُس پر مزید مہرِ تصدیق آپ کے اُن فرمودات سے ثبت ہو گئی جو آپ نے اغلباً ہوسٹن میں ارشاد فرمائے تھے)

بنا بریں پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام و نفاذ کے عظیم معرکے کے آپ کے ہاتھوں سر ہونے کی اب کم از کم مجھے کوئی امید باقی نہیں رہی ——— اور مجھے اِس رائے تک پہنچنے میں کہ یہاں اسلام صرف انقلابی طریق کار ہی سے آسکتا ہے، آپ کے اِس جملے نے بھی مدد دی جو بلدیاتی نمائندوں کے ایک اجلاس میں ایک برقع پوش خاتون کونسلر کے تابڑ توڑ سوالات کے جواب میں، کہ آپ نفاذِ اسلام کے لیے یہ کیوں نہیں کرتے یا وہ کیوں نہیں کرتے یا آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "بیٹی! اِس ملک میں اسلام کسی انقلابی عمل کے نتیجے میں نہیں آرہا کہ ہم اتنے بڑے بڑے قدم اٹھا سکیں!!"

نفاذِ اسلام کے دعووں اور اُس کے ضمن میں ظاہری اور سطحی، اور نیم دلانہ ہی نہیں خالص نمائشی اقدامات کا متذکرہ بالا ردِّعمل، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ملک گیر تھا۔ بلکہ جن لوگوں کو بیرونِ ملک جانے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اُن کے کانوں نے یہاں کے تمسخر و

استہزار کی بازگشت دُور دراز کے ممالک میں بھی سُنی، لیکن اندرونِ سندھ تو یہ گویا ملحد اور بے دین لوگوں، کمیونسٹوں اور مارکسسٹوں، اور سب سے بڑھ کر روس اور بھارت کے ایجنٹوں کے لیے سنہری موقع تھا جس سے اگر وہ بھرپور فائدہ اٹھاتے تو خود اپنے نظریۂ حیات سے غداری کے مرتکب ہوتے۔ نتیجہ نگاہوں کے سامنے ہے کہ آج اُن قدیم سندھی مسلمانوں کی تعلیم یافتہ نوجوان نسل کا بہت بڑا حصّہ، جو خود اب بھی نہایت گہرے مذہبی مزاج کے حامل ہیں، مذہب کا نام تک سننے کو تیار نہیں، اور دین اور شعائرِ دینی سے کھلم کھلا بیزاری کا اظہار کر رہا ہے۔

(۳) مارشل لاء کے تسلسل کا تیسرا نتیجہ جو صوبۂ سندھ کے ساتھ خاص تھا یہ نکلا کہ اس عرصے کے دوران مہاجرین اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے ردِّ عمل میں مزید شدّت پیدا ہوتی۔ یہاں تک کہ اُن کی جوابی کارروائی میں "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مطابق جارحانہ انداز بھی پیدا ہو گیا۔ اس کا سبب یہ ہوا کہ ایک تو اس دَور میں بھی کوٹہ سسٹم اور دیہی اور شہری کی تقسیم جُوں کی توں برقرار رہی۔ دوسرے مارشل لاء نے اپنے براہِ راست عمل دخل کو، بالخصوص صوبۂ سندھ میں، لاء اینڈ آرڈر اور امن و امان کے زیادہ بڑے اور اہم معاملات تک محدود رکھا اور نسبتاً چھوٹے اور بظاہر غیر اہم واقعات کے ضمن میں صرفِ نظر ہی نہیں غضِّ بصر سے کام لیا۔ لہٰذا انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ غیر سندھی نوجوانوں پر تعلیم اور معیشت کا دائرہ تنگ سے تنگ تر کرتے چلے جائیں ——— اور نوبت بایں جا رسید کہ لاڑکانہ اور نواب شاہ کے کالجوں میں پنجابی اور مہاجر طلبہ کے داخلے کے فارم پھاڑ ڈالے گئے اور انہیں زدوکوب کر کے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اور لطف یہ کہ یہ سب کچھ مارشل لاء انتظامیہ کی عین ناک تلے ہوتا رہا۔ اس عدم تحفّظ کے احساس سے جو مایوسی اور دل شکستگی پیدا ہوئی تھی اب اُس میں غصّے اور جھنجھلاہٹ کا عنصر بھی شامل ہو گیا اور وہ مرنے مارنے پر تُل گئے! ——— چنانچہ اس وقت راقم الحروف کو مہاجر نوجوانوں میں بالکل اُن کیفیات کا مشاہدہ ہو رہا ہے جن کا اظہار بھارت کے بعض مسلمانوں نے ۱۹۸۰ء میں تقسیمِ ہند کے بعد راقم کے پہلے سفرِ بھارت کے موقع پر کیا تھا۔ جو اُن ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ: "۱۹۷۰ء تک ہمارا یہ خیال تھا کہ ہمارا محافظ

پاکستان ہے، لیکن اُس کے بعد سے ہمارا احساس یہ ہے کہ پاکستان تو اب اپنی حفاظت ہی کرلے تو بڑی بات ہے، ہمیں تو اب بھارت میں خود اپنے زورِ بازو کے بل پر جینا ہے اور اپنی حفاظت آپ کرنی ہے، لہٰذا ہم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ آئندہ بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح نہیں ہوں گے بلکہ مرنا ہی ہوا تو مار کر مریں گے!" ——— چنانچہ سندھ میں آباد اردو بولنے والے مہاجرین کی نوجوان نسل کے بھی کچھ ایسے ہی احساسات اور جذبات ہیں جن کی کوکھ سے پہلے تو جنم لیا بعض مہاجر طلبا تنظیموں اور نیو سندھی کلچرل ایسوسی ایشنوں، نے جو نسبتاً دھیمی بھی تھیں اور دفاعی انداز کی حامل بھی ——— اور بعد ازاں ان ہی احساسات و جذبات کی کوکھ سے برآمد ہوئیں مہاجر اتحاد تحریک (M.I.T.) اور مہاجر قومی موومنٹ (M.Q.M.) ایسی فعال و متحرک بلکہ طوفانی انداز کی حامل تحریکیں جن کا اثر و نفوذ دیکھتے ہی دیکھتے جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔

اب تک کے بچاؤ کے دو اسباب

مارشل لاء کے تسلسل کے تین متذکرہ بالا نتائج کا مجموعی حاصل تو فطری اور منطقی اعتبار سے یہ ہونا چاہیئے تھا کہ سندھ میں ۱۹۷۲ء کی تاریخ بار بار دہرائی جاتی اور لسانی فسادات آئے دن ہوتے رہتے لیکن دو اسباب کی بنا پر، جن میں سے ایک کو مثبت قرار دیا جاسکتا ہے اور دوسرے کو منفی، ایسا نہیں ہوا ——— اور سندھی نیشنلزم کی آگ اندر ہی اندر تو سلگتی بھی رہی اور پھیلتی بھی چلی گئی لیکن، الحمدللہ کہ ۱۹۷۲ء کے بعد سے آج تک سندھ میں نہ کوئی نمایاں سندھی مہاجر تصادم ہوا نہ سندھی پنجابی۔ تو آیئے کہ اب ذرا اُن اسباب کا جائزہ لے لیں!

(۱) ان میں سے مثبت سبب، کا کریڈٹ تو مولانا مفتی محمودؒ کی قائم کردہ ایم آر ڈی کو جاتا ہے جس نے قومی سطح پر بحالیٔ جمہوریت کی تحریک چلا کر محاذ آرائی کو اُفقی سمت میں موڑے رکھا اور سیاسی عناصر کی توجہات کو جمہوریت کی بحالی اور مارشل لاء کے خاتمے پر مرکوز کر کے لسانی اور علاقائی تقسیم اور اس سے پیدا ہونے والی عمودی محاذ آرائی کو پس منظر میں دھکیل دیا۔

چنانچہ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۶ء میں دو مرتبہ سندھ میں جو آتش فشاں پھٹا وہ بحالیٔ جمہوریت ہی کے نام پر پھٹا، یہ دوسری بات ہے کہ دونوں بار اس سے جو لاوا برآمد ہوا وہ سندھی نیشنلزم ہی کا پیدا کردہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں مواقع پر یہ تحریک جو اصلاً ملک گیر تھی، صرف صوبۂ سندھ اور اس کے بھی صرف اندرونی دیہی علاقوں کی عوامی شورش کی صورت اختیار کر کے رہ گئی۔

(۲) اب تک کے بچاؤ کی دوسری اور منفی وجہ سندھی نیشنلزم کی انتہا پسند قیادت اور اسلام اور پاکستان کے دشمنوں کی یہ حقیقت پسندی (REALISM) ہے، جس پر وہ بلاشبہ "شیطان کو بھی اُس کا حق ادا کرو" (GIVE THE DEVIL HIS DUE) کے اصول کے مطابق داد کے مستحق ہیں، کہ وہ بیک وقت پاکستان آرمی، پنجابی آبادکاروں اور اُردو بولنے والے مہاجروں سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انہوں نے یہ دوہری حکمتِ عملی اختیار کی کہ ایک طرف اپنی اصل قوت کو کسی براہ راست تصادم سے بچا کر گویا محفوظ (RESERVE) رکھا جائے اور اس سے صرف نظریاتی پرچار کا کام لے کر اپنے حلقۂ اثر اور دائرہ نفوذ کو بڑھایا جاتا رہے اور انتظار کیا جائے کہ حکومت پاکستان کے عمائدین اور تحریکِ بحالیٔ جمہوریت کے قائدین میں سے کسی ایک یا دونوں کی بے بصیرتی اور بے تدبیری سے ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ مشرقی پاکستان کی طرح سندھ میں بھی بھارت کو دخل اندازی کا کوئی جھوٹ موٹ کا بہانہ حاصل ہو جائے اور اس طرح اُن کی تمنا بآسانی بر آئے!۔ اور چونکہ یہ مقصد صرف اس طرح حاصل ہو سکتا تھا کہ حکومت پاکستان اور ایم آر ڈی کے مابین کشمکش طول کھینچے اور اس میں زیادہ سے زیادہ تلخی پیدا ہو لہٰذا مسٹر جی ایم سید اور اُن کے حواری ایم آر ڈی میں شامل جماعتوں پر طنز و طعن کے تیر برسا کر اُن کے لیے ع "تیز ترک گامزن" کی صورت بھی پیدا کرتے رہے اور مارشل لاء کے تسلسل کو خوش آئند قرار دینے کے علاوہ صدر ضیاء الحق کی ذاتی خوش اخلاقی کی تعریفیں بھی کرتے رہے۔ انتہا پسند سندھی قوم پرستی کی دوہری حکمتِ عملی کا دوسرا اور زیادہ خطرناک رُخ یہ تھا کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ سندھ میں آباد غیر سندھی اقوام آپس میں لڑ پڑیں اور الفاظ قرآنی

"لِيَبْلُوَكُمْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ" (سورۃ انعام: آیت نمبر ۱۶۵) کے مطابق آپس میں ایک دوسرے ہی کی قوّت کا مزہ چکھیں۔ اور اس طرح بجائے اس کے کہ 'سندھو دیش' کی آبیاری قدیم سندھیوں کے خون سے ہو، اس درخت کی جڑوں کو 'دشمنوں' ہی کے خون سے سینچا جائے! ——— چنانچہ انتہا پسند سندھی قیادت نے ۱۹۷۲ء کے فوراً بعد ہی اِس برملا اعتراف کے ساتھ کہ ہم نے بیک وقت دو محاذوں پر جنگ چھیڑ کر غلطی کا ارتکاب کیا تھا، آئندہ کے لیے اپنی اس نئی حکمتِ عملی (STRATEGY) کا کھلّم کھلا اظہار شروع کر دیا تھا کہ آئندہ ہم پنجابیوں اور مہاجروں کو 'ISOLATE' کر کے ان دونوں سے باری باری اور علیٰحدہ علیٰحدہ نمٹیں گے۔ چنانچہ ابتداءً تو یہ کہا گیا کہ پنجابی اور سندھی تو فرزندانِ زمین بھی ہیں اور اُن کے مابین ہزاروں سال پُرانے تہذیبی و ثقافتی مراسم بھی ہیں۔ جبکہ اُردو بولنے والے "ماکڑ" پھک منگے "پناہ گیر" ہیں جن سے چھٹکارا حاصل کرنا پنجابیوں اور سندھیوں دونوں کے لیے ضروری ہے۔ لیکن جب یہ محسوس ہوا کہ یہ دال گلنی مشکل ہے اور سندھ میں پنجابیوں کی تعداد بھی بہت کم ہے جبکہ تعداد کے اعتبار سے کسی درجے میں مقابلے میں آنے کے قابل اور خاص طور پر سندھ کے شہروں پر "قابض" تو مہاجر ہیں تو رُخ بدل کر یہ کہا جانے لگا کہ مہاجرین یعنی نئے سندھی اور پرانے اور اصل سندھی تو آپس میں بھائی بھائی ہیں اور انہیں ہمیشہ سندھ ہی میں رہنا ہے، البتہ پنجاب کے لوگ سندھ میں ایک خارجی اور بدیسی عنصر کی حیثیّت رکھتے ہیں اور فی الحقیقت وہی سیاسی اور معاشی دونوں اِعتبارات سے اصل استحصالی طاقت بھی ہیں، لہٰذا نئے اور پرانے سندھیوں کو متحد ہو کر اُن سے گلوخلاصی کی کوشش کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہی ہے وہ فلسفہ اور حکمتِ عملی جس کی کوکھ سے سندھ میں مہاجرین کے ردِّعمل کے تیسرے دَور کا آغاز ہوا تھا اور سندھی نیشنلزم کے انتہا پسند علمبرداروں اور اسلام اور پاکستان کے کھلے دشمنوں کی ہوشیاری اور چابک دستی کو ایک بار پھر داد دینی پڑتی ہے کہ گزشتہ دو تین سال کے دَوران حالات واقعتہً اُن ہی کے بنائے ہوئے نقشے کے مطابق آگے بڑھتے نظر آرہے تھے۔ چنانچہ ایک جانب سندھی قوم پرستوں اور مہاجر رہنماؤں کے مابین ملاقاتوں

اور مذاکرات کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے میں 'سندھ یونٹی بورڈ' کی قسم کے ادارے وجود میں آئے اور دوسری طرف عوامی سطح پر گلی کوچوں میں "مہاجر سندھی بھائی بھائی۔ تیسری قوم کہاں سے آئی" کے 'ترانے' سنائی دینے لگے اور نوبت بایں جارسید کہ کراچی کے بعض تعلیمی اداروں کے بارے میں خبریں ملیں کہ وہاں طلبہ کی باہمی محاذ آرائی اسی اساس پر اُستوار ہو گئی ہے کہ ایک جانب قدیم سندھی اور اُردو بولنے والے مہاجر طلبہ کا متحدہ محاذ ہے اور دوسری طرف پنجابی طلبہ۔ لیکن ابھی یہ معاملہ ابتدائی مراحل ہی میں تھا اور طالب علموں کے حلقے سے شروع ہونے والی بات کو گلی کوچوں تک آنے کے لیے ابھی کچھ مزید وقت درکار تھا کہ اچانک مہاجرین کی نوجوان نسل کی "تنگ آمد بجنگ آمد" والی نفسیاتی کیفیت نے ایک نیا 'دھماکہ' کر دیا۔

مہاجر پٹھان تصادم

اِس تازہ دھماکے سے مراد' ظاہر ہے کہ' وہ انتہائی خوفناک اور وحشیانہ خونی تصادم ہے جو سندھ میں 'مہاجرین' کے دو سب سے بڑے مراکز یعنی کراچی اور حیدرآباد میں 'اُردو بولنے والوں' اور پٹھانوں کے مابین ہوا اور جسے پاکستان کے اساسی نظریے اور مسلم قومیّت کے تصوّر کے تابوت میں آخری میخ یا مریض کی آخری ہچکی نہیں تو کم از کم خطرے کے آخری سگنل سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے!

اِس انتہائی افسوسناک تصادم کے بارے میں تاحال نہ خود راقم الحروف کسی نظریاتی پس منظر یا کسی سوچی سمجھی اسکیم کا سراغ لگا سکا ہے ——— نہ ہی کسی اور مبصر یا تجزیہ نگار نے ایسی کسی چیز کی نشاندہی کی ہے۔ اور اس کے اصل اسباب میں سوائے دو عوامل کے، کوئی تیسرا سبب کم از کم بظاہر احوال نظر نہیں آتا: (یہ دوسری بات ہے کہ مستقبل میں ثانوی طور پر اسے ملک و مِلّت کے دشمن اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کریں، جس کے بعض آثار ظاہر ہو بھی رہے ہیں۔)

(۱) اِس کا پہلا سبب مہاجرین کی نوجوان نسل کی وہ مایوسی اور بددلی ہے جس کے تاریخی

پس منظر اور اسباب وعوامل کا بیان بھی تفصیلاً ہو چکا ہے اور جس میں درجہ بدرجہ تیزی و تُندی اور غصّے اور جھنجھلاہٹ کے اضافے کی داستان بھی بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ مزید نوٹ کر لیا جائے کہ یہ احساسات وکیفیات بھارت کے دوسرے علاقوں سے تعلق رکھنے والے مہاجرین کے مقابلے میں بہاری مسلمانوں میں نہایت شدید ہیں۔ اس لیے کہ ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کا قتلِ عام بھی یا مشرقی پنجاب اور کسی قدر دہلی اور اس کے گرد و نواح میں ہوا تھا یا بنگال و بہار میں۔ اور ان علاقوں سے مسلمانوں کا انخلا جبری بھی تھا اور پُرتشدّد بھی۔ جبکہ جنوبی ہند کے علاوہ یوپی، سی پی اور راجپوتانہ سے مسلمانوں کی ہجرت زیادہ تر اختیاری بھی تھی اور نسبتاً پُرامن بھی۔ مزید برآں ۱۹۷۱ء کی قیامت تو تقریباً کُلیتہً ٹوٹی ہی صرف بہاری مسلمانوں پر۔ جن میں سے کئی لاکھ آج پندرہ سال گزر جانے کے باوجود بھی بنگلہ دیش میں "ثُمَّ لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَلَا یَحْیٰی" (سورۃ الاعلیٰ: آیت نمبر ۱۳) "پھر اُس میں نہ جئیں گے نہ مریں گے"، کی کیفیت میں مبتلا ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس قسم کے حالات میں اگر انسان ہوش کھو بیٹھے اور جذبات سے مغلوب ہو جائے تو اسے دوش نہیں دیا جا سکتا۔

(۲) اس کا دوسرا سبب یہ ہے کہ شہروں کے معاملے میں کسی منصوبہ بندی اور کنٹرول کے فقدان کی بنا پر بالکل خودرَو جھاڑیوں کی مانند پھیل جانے والی بستیوں اور بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ بڑھنے والی آبادی کی بنا پر شہری زندگی کی مشکلات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے جن میں ٹریفک کے مسائل سرفہرست ہیں ——— پھر جس طرح زندگی کے دوسرے شعبوں میں ابتری اور افراتفری کا دَور دَورہ ہے اسی طرح اِس شعبے میں بھی بدعنوانیاں، اور بے پرواہی اور سنگدلی کے مظاہر عام ہیں جن کی بنا پر ٹریفک کے حادثات اور انسانی جانوں کا ضیاع روز افزوں ہے ——— یہ صورتِ حال یوں تو ملک کے تمام ہی بڑے شہروں میں موجود ہے۔ لیکن "حِصّہ بقدرِ جُثّہ" کے اصول کے مطابق اور اُس پر مستزاد بعض دوسرے عوامل کی بنا پر کراچی میں انتہائی شدّت کے ساتھ پیدا ہو گئی ہے۔

کراچی کی مزید بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں ایک طرف اِس شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے اکثر و بیشتر لوگ، یعنی منی بسوں، ویگنوں اور ٹیکسیوں کے مالک اور ڈرائیور نہ صرف ایک ہی قوم بلکہ زیادہ تر ایک ہی علاقے کے باشندے ہیں یعنی وزیرستان کے قبائلی پٹھان، اور دوسری طرف کراچی کی آبادی کی عظیم اکثریت ویسے بھی اُردو بولنے والے 'مہاجرین' پر مشتمل ہے، مزید برآں بعض گنجان آباد علاقے جن میں سے کراچی کی مضافاتی بستیوں کا تیز و تند اور اندھا دھند ٹریفک گزرتا ہے اور جنہوں نے ٹریفک کی فنی اصطلاح کے مطابق "بوتلوں کے تنگ دہانوں" (BOTTLE-NECKS) کی صورت اختیار کر لی ہے، وہاں کی آبادی صد فی صد مہاجرین پر مشتمل ہے۔ اس طرح کراچی میں ٹریفک کی مخصوص صورتِ حال نے دو 'قومیتوں' کے مابین ابتداً شکر رنجی اور پھر باضابطہ کشیدگی پیدا کر دی۔

چنانچہ ایک جانب معاشی اور معاشرتی مسائل اور شہری زندگی کی عام مشکلات کی بنا پر اعصاب کے مستقل تناؤ اور دوسری جانب اندھا دھند ڈرائیونگ کے نتیجے میں رونما ہونے والے ٹریفک کے حادثات کا یہ نتیجہ تو کئی سال سے نکل رہا تھا کہ جہاں کسی حادثے میں کوئی انسانی جان ضائع ہوئی فوراً متعلقہ بس یا منی بس یا ویگن نذرِ آتش کر دی گئی۔ جب بات اور آگے بڑھی تو آتشِ غیظ و غضب نے صرف متعلقہ گاڑی ہی نہیں مزید گاڑیوں کو بھی بھسم کرنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح دو 'قومیتوں' کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا جس نے بڑھتے بڑھتے 'تصادم' کی صورت اختیار کر لی جس کا عنوان ابتداً "بہاری پٹھان تصادم" بنا تھا جس کی ایک نہایت افسوسناک صورت کچھ عرصہ قبل اورنگی ٹاؤن، پٹھان کالونی اور بنارس چوک کے علاقے میں پیدا ہوئی تھی جس کے ضمن میں بعض نہایت دلدوز اور لرزہ خیز واقعات بھی اخبارات میں رپورٹ ہوئے تھے۔ چنانچہ حسّاس اور صاحبِ شعور لوگوں کا ماتھا اُسی وقت ٹھنکا تھا کہ "یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین۔ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ"۔ ——— لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب وہ پردہ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے آخری دن اور نومبر کے ابتدائی ایّام میں اچانک اُٹھا تو جو بھیانک منظر سامنے آیا اور اس تصادم نے مزید وسعت اختیار کر کے "مہاجر پٹھان آویزش"

کی جو صورت اختیار کی اُس کا کسی بڑے سے بڑے صاحب بصیرت انسان کو بھی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ ان ایام میں رُونما ہونے والے واقعات و حوادث نے وحشت و بربریت کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ کم از کم مغربی پاکستان کی پوری چالیس سالہ تاریخ کے جملہ ریکارڈ توڑ ڈالے ——— بلکہ بلا مبالغہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۷۱ء کی یاد تازہ کر دی!

حالات کی پیچیدگی اور منطقی نتیجہ!

انتہا پسند سندھی قوم پرستوں کے نزدیک تو یہ مہاجر پٹھان تصادم بھی یقیناً بہت خوش آئند ہو گا۔ اس لیے کہ اُن کے نزدیک تو سندھ کی سرزمین پر ہر غیر سندھی ناپسندیدہ ہے خواہ وہ مہاجر ہو یا پنجابی یا پٹھان۔ اور ان میں سے کوئی سے دو فریق بھی آپس میں لڑیں اُن کی منزلِ مقصود بہر صورت قریب آتی ہے۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ یہ تصادم اُن کے موجودہ نقشۂ کار کے مطابق نہیں ہوا بلکہ اس نے اُنہیں فوری طور پر ایک مشکل سے دوچار کر دیا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت اُنہیں وسیع تر ملکی سیاست کی سطح پر پنجاب کے خلاف پٹھانوں اور بلوچوں دونوں کا تعاون درکار ہے۔ جس کے حصول کی سعی کا مظہرِ اوّل ممتاز بھٹو اور حفیظ پیرزادہ کا "سندھی بلوچی پختون متحدہ محاذ" ہے اور مظہرِ ثانی سندھی نیشنلزم کے گورو مسٹر جی ایم سیّد اور سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کے مابین حال ہی میں شدت اختیار کرنے والی محبت اور خیر سگالی ہے ——— اور مقامی سطح پر سندھ میں وہ فی الوقت لڑانا چاہتے تھے مہاجروں اور پنجابیوں کو، جبکہ بالفعل تصادم ہو گیا مہاجروں اور پٹھانوں میں۔ گویا اُن کے موجودہ نقشۂ کار کے مطابق اُن کے دو دوست اور اتحادی آپس میں لڑ پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ 'بابائے سندھ' ایک جانب در پردہ پیٹھ ٹھونک رہے ہیں مہاجر قومی موومنٹ کی اور دوسری جانب تعزیتی پیغام ارسال کر رہے ہیں بابائے پختون باچا خان کی خدمت میں۔ (چنانچہ اسی اساس پر مہاجر اتحاد تحریک' مہاجر قومی موومنٹ کو ہدفِ تنقید بنا رہی ہے)

اِس سے بھی بڑی پیچیدگی جو نوشتۂ دیوار کے مانند ہر صاحبِ عقل و بصیرت کے سامنے ہے، (خواہ کوئی اُسے اپنی کسی وقتی مصلحت کے تحت کتنا ہی نظر انداز کرنا چاہے۔) وہ یہ ہے کہ اگر موجودہ صورتِ حال میں کوئی انقلابی تبدیلی نہیں آتی اور متحدہ مسلم قومیّت کے متعدد قومیتوں میں تحلیل ہونے کا عمل جاری رہتا ہے تو اس کا لازمی اور منطقی تقاضا وہی ہے جو مہاجر نوجوانوں کی دونوں فعال تحریکوں کا مشترک نعرہ بن گیا ہے یعنی یہ کہ ایک کروڑ کے لگ بھگ اُردو بولنے والوں کو بھی ایک مستقل اور جداگانہ قومیت کی حیثیّت سے تسلیم کیا جائے جس کا آخری منطقی نتیجہ سندھ کی تقسیم ہوگا جسے سندھی قوم پرستی کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اگر حالات کا رُخ یہی رہتا ہے جواب ہے تو اصل مقابلہ اور ہولناک ترین تصادم قدیم اور جدید سندھیوں ہی کے مابین ہوگا جس کے ضمن میں حال ہی میں مکہ مکرّمہ میں مقیم ایک دینی مزاج کے حامل سندھی دانشور کی زبان سے نہایت گہرے تاثر کے ساتھ جو الفاظ نکلے انہیں سُن کر راقم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ ——— "ڈاکٹر صاحب! بہت خون بہے گا!"

الغرض ابرِ عظیم ہندو پاک کے اوّلین "بابُ الاسلام"، سندھ کی موجودہ صورتِ حال بالکل وہی ہے جس کی جانب عظیم فتنوں کی پیشین گوئیوں پر مشتمل احادیثِ نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں اشارات ملتے ہیں کہ اُن کے دوران اپنے اور غیر کے مابین تمیز اور دوست دشمن کی پہچان ناممکن ہو جائے گی اور اچھے اچھے صاحبِ عقل و بصیرت لوگ بھی حیران و پریشان کھڑے رہ جائیں گے کہ ع "کس طرف جاؤں، کدھر دیکھوں، کسے آواز دوں!" یہی وجہ ہے کہ راقم نے اس سلسلۂ مضامین کا عنوان بنایا تھا حضرت اکبرؔ کے اِس شعر کو کہ ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود، لاکھوں پیچ پڑتے ہیں!
عقیدے، عقل، فطرت سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

شر میں سے خیر

منطقی اعتبار سے متذکرہ بالا صورتِ حال کے دو ہی نتائج ممکن ہیں: یا کامل تباہی، یا کوئی فوری انقلابی تبدیلی اور بالکل جڑ بنیاد سے نئی تعمیر اور نشأۃِ ثانیہ! ——— اور اگر حالات کے رُخ اور واقعات کی رفتار کا صغریٰ کبریٰ جوڑا جائے تب تو مقدم الذکر ہی کے دَل بادل چھائے نظر آتے ہیں لیکن ؎

"تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن ——— پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!"

کے مصداق ہر مومن و مسلم اور ہر مخلص پاکستانی کی دعا تو یہی ہوگی کہ ؎

"رحم کر اپنے نہ آئینِ کرم کو بھول جا ——— ہم تجھے بھولے ہیں لیکن تو نہ ہم کو بھول جا!"

مزید برآں، ہمارا ایمان ہے کہ اللہ ہر شے پر قادر ہے اور جو بھی ارادہ فرمالے اُسے پورا کر گزرنے والا ہے ——— اور اُس کی شان یہ ہے کہ "يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" (سورۃ روم: آیت نمبر ۱۹۔ ترجمہ: "وہ نکال لاتا ہے زندہ کو مردہ میں سے اور مردہ کو زندہ میں سے اور زندہ کر دیتا ہے زمین کو اُس کے مُردہ ہونے کے بعد!") لہٰذا اُس کے رحم و کرم اور قوّت و قدرت سے ہرگز بعید نہیں کہ وہ موجودہ صورتِ حال کو یکسر تبدیل کر دے ——— اور الحمدللہ کہ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کی "چشمِ قلب" (MIND'S EYE) "مہاجر سندھی بھائی بھائی" کے نعرہ ہی میں جو اصلاً انتہا پسند سندھی نیشنلزم کی جنگی حکمتِ عملی کا مظہر بن کر سامنے آیا ہے، ایک ممکنہ خیر کا پہلو دیکھ رہی ہے اور ان شاء اللہ العزیز "وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ" (سورۃ آلِ عمران: آیت نمبر ۵۴، ترجمہ "اور انہوں نے چال چلی اور اللہ نے بھی چال چلی اور اللہ تو سب سے بہتر چال چلنے والا ہے ہی!") کے مصداق اسلام اور پاکستان کے دشمن خود اپنی ہی تدبیروں کے ہاتھوں مات کھائیں گے ——— بقول علامہ اقبالؔ ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے ——— کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا
چنانچہ اگر اللہ نے چاہا تو قدیم سندھی مسلمانوں اور ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں ہی کے دینی اتحاد سے برعظیم ہند و پاک میں اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کے لیے سب سے مؤثر قوت فراہم ہوگی۔ اس لیے کہ ایک طرف صنم خانہ ہند میں اسلام کی قدیم ترین اور عربی الاصل روایات کی امین سرزمینِ سندھ ہے اور دوسری طرف ہندوستان کے مختلف علاقوں سے 'اختیاری ہجرت' کر کے پاکستان آنے والے مہاجرین اُس وقت بھی جذبۂ ملی سے دوسروں کی نسبت زیادہ سرشار تھے اور گوناگوں قسم کی مایوسیوں اور حالات کی شدید ابتری کے باوجود اِن میں تاحال بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو ؎ "ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک - اُس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!" کے مصداق دینی و ملّی جذبے کی وافر مقدار سے بہرہ ور ہیں اور اُن کے دل کے کانوں میں اب بھی علّامہ اقبال کا یہ ترانۂ ملّی گونج رہا ہے کہ ؎ "چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا۔ مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا!" مزید برآں ان میں ایک معتدبہ تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جنہیں بجا طور پر برعظیم پاک و ہند میں 'الفِ ثانی' یعنی امتِ مسلمہ کے دوسرے ہزار سالہ دَور کی چار سو سال پر محیط تجدیدی مساعی کا وارث قرار دیا جا سکتا ہے۔

اور اب ضرورت صرف اِس امر کی ہے کہ ان دونوں طبقات میں سے اُن لوگوں کی غیرتِ دینی اور حمیّتِ ملی کو للکارا جائے جو اللہ، اُس کے رسولؐ، اس کی کتاب اور اُس کے دین کے ساتھ ع "جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں" کے مصداق خلوص و اخلاص کا تعلق رکھتے ہوں اور اُنہیں آمادہ کیا جائے کہ وہ ع "میری دنیا لُٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا!" پر عمل کرنے اور ملک و ملت کے مستقبل کو جذباتی نوجوانوں کے حوالے کر کے خود گوشۂ عافیت میں پڑے رہنے کی روش کو ترک کریں اور وقت کی نزاکت اور حالات کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے ع "نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیریؓ!" کے مطابق کمرِ ہمت کس کر میدانِ عمل میں اُتر آئیں۔

اگر ایسا ہو جائے تو کیا عجب اللہ تعالیٰ انہیں الفاظِ مبارکہ " وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ

التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا " (سورۃ فتح : آیت نمبر ۲۶- ترجمہ " اور اللہ تعالیٰ نے چسپاں کر دی ان پر تقویٰ کی بات اور وہ اس کے حقدار بھی تھے اور اہل بھی ") کا مصداق بنا دے اور چشم فلک ایک بار پھر وہ نظارہ دیکھ سکے جو اس نے آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل رائی پور اور پیر جو گوٹھ کی خانقاہوں میں سیّد احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہما اور ان کے ان ساتھیوں کی مہمان نوازی اور خاطر مدارات کی صورت میں دیکھا تھا جن کا تعلق دہلی و یوپی، بنگال و بہار اور راجپوتانہ وغیرہ کے علاقوں سے تھا -!

البتہ یہ کب اور کیسے ہو سکتا ہے ؟ اس کے جواب کے لیے ہمیں موجودہ خوفناک صورت حال کے پس منظر اور اسباب و عوامل کا جائزہ لینے کے بعد اب یہ سوچنا ہو گا کہ اس کا بنیادی اور مستقل علاج کیا ہے اور اس مزمن مرض میں جو ثانوی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کے ازالے کیلئے کیا فوری اقدامات ضروری ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ آئندہ صحبت میں اسی موضوع پر گفتگو ہو گی۔

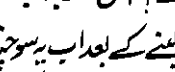

ڈاکٹر اسرار احمد

کی تالیف

استحکامِ پاکستان

اشاعت خاص ۳۰/- ۲۰/- روپے

اشاعت عام ۱۲/- روپے

قریبی بک شال سے طلب فرمائیں یا براہ راست درج ذیل پتہ پر لکھیں

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶- کے ماڈل ٹاؤن

فون: ۸۵۲۶۱۱۱

پاکستان کیوں بنا — کیسے بنا

پاکستان کیوں ٹوٹا — کیسے ٹوٹا

اب ٹوٹا تو ------

پاکستان کی تاریخ کا حقیقت پسندانہ تجزیہ

اندھیروں میں اُمید کی ایک کرن

لفظ لفظ میں — وطن کی محبّت

سطر سطر میں — ایمان کی پاشنی

عمل کا پیغام ------

اس کتاب کا مطالعہ خود بھی کیجئے اور اسے زیادہ سے زیادہ عام کیجئے

الہدیٰ

نشست

ٹیلی ویژن پر نشر شدہ دروس کا سلسلہ (درس ۱۱)

مباحث عمل صالح

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

(سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں)

ڈاکٹر اسرار احمد

۳

السلام علیکم ۔ نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم ۔ اما بعد

فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ۝
يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ۝

صدق اللہ العظیم

" اور وہ لوگ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو ۔ اور نہ وہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ، اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں، اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اس کی پاداش پائیگا ۔ دگنا کیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن، اور وہ رہے گا ۔

اس میں ہمیشہ ہمیش نہایت ذلیل و خوار ہو کر۔"

معزز حاضرین اور محترم ناظرین!

یہ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی دو درمیانی آیات ہیں جن کی تلاوت اور ترجمہ ابھی آپ نے سماعت فرمایا۔ سلسلۂ مضمون وہی ہے کہ اللہ کے محبوب بندوں میں کون سے اوصاف ہوتے ہیں اور وہ کون سے کام ہیں جن سے وہ مجتنب رہتے ہیں۔ پچھلے درس میں ہمارے سامنے وہ مثبت اوصاف اور مثبت اقدار آئیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔ جن سے ایک بندۂ مومن کی شخصیت میں دل آویزی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے جو ایک مومن کی شخصیت کی پختگی اور 'MATURITY' کی علامات ہیں۔ آج کی ان دو آیات میں انداز بیان منفی ہے۔ یعنی یہ یہ چیزیں اُن میں بالکل نہیں ہوتیں۔ وہ ان چیزوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ لیکن اس سلسلے میں قرآن مجید کی حکمت کا اہم باب ہمارے سامنے آ رہا ہے، جس سے ہمیں اندازہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند کون سی صفات ہیں! وہ کون کون سے کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب اور مبغوض ہیں جن سے وہ سخت ناراض ہوتا ہے اور جن سے اس کا غیض و غضب شدید ترین طور پر بھڑکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارے یہاں جو یہ تصوّر ہے کہ ایک ہوتے ہیں گناہ کبیرہ — اور ایک گناہ ہوتے ہیں گناہ صغیرہ۔ تو ہم سمجھیں کہ کبیرہ گناہوں میں چوٹی کے گناہ کون سے ہیں!! آج کی پہلی آیت چوٹی کے تین گناہوں کو معین کرتی ہے۔ یعنی اس ایک آیت میں کبائر میں سے درجہ بدرجہ تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر ہے۔ سب سے کبیرہ گناہ، عظیم ترین گناہ، جس کے بارے میں سورۃ النساء میں دو مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ اللہ اُس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کمتر (گناہ)، جس کے لئے چاہے گا معاف فرما دے گا"۔ گویا قرآن مجید کی رُو سے ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم، سب سے بڑا اور قطعی ناقابلِ معافی گناہ شرک ہے۔ یاد ہوگا کہ سورہ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں "اقسام شرک" کے موضوع پر کچھ مختصر گفتگو ہوئی تھی کہ ایک شرک ہے شرک فی الذات۔ اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ ایک

شرک وہ ہے جو اللہ کی صفات کے ضمن میں ہے ۔ یعنی شرک فی الصفات ۔ اور تیسرا شرک ہے شرک فی العبادت ۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبادت کے لب لباب کی حیثیت دی ہے دُعا کو : اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَۃِ اور اَلدُّعَآءُ هُوَ الْعِبَادَۃُ ۔ " دُعا ہی عبادت کا اصل جوہر ہے " اور " دُعا ہی اصل عبادت ہے " لہٰذا یہاں آپ نے دیکھا کہ فرمایا : وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ " وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے " یہ پکارنا کس مقصد کے لئے ہوتا ہے : استمداد، استدعا، استغاثہ، استعانت کے لئے یعنی کسی کو پکارنا اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی کسی مصیبت کو دور کرنے کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی حاجت روائی کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی مشکل کشائی اور دستگیری کے لئے ۔ پکارنا کسی کو اپنی مدد و اعانت کے لئے ۔ نوٹ کیجئے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو پکارے بلکہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا یہ شرک ہے ۔ پس یوں سمجھئے کہ ہمارے دین میں شرک تو اکبر الکبائر ہے ۔ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا کبیرہ گناہ شرک ہے ۔ چنانچہ آغاز میں سب سے پہلے تو اُسی کا ذکر ہوا ۔ اس لئے کہ درحقیقت شرک سے انسان کا نقطۂ نظر غلط ہو جاتا ہے گویا پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی لگ گئی ۔ اس کے بعد اس کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے کہ

؎ خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج   تا ثریا می رود دیوار کج

پھر تو کجی ہی کجی ہوگی ۔ انسان کی اپنی ذاتی سیرت میں بھی کجی ہوگی ۔ ایسے لوگوں پر مشتمل جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ بھی کج ہوگا ۔ لہٰذا یہاں سب سے پہلے شرک کا ذکر ہوا ۔

دوسرا : وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ انسانی جان کے احترام سے متعلق ہے ۔ یہ بات جان لیجئے کہ شرک کے بعد قتل عمد سب سے بڑا گناہ ہے ۔ یہ اس لئے کہ اس سے تمدن کی جڑ کٹ جاتی ہے یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک متمدن حیوان ہے ۔ انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ : " MAN IS A GREGORIOUS ANIMAL " تمدن کی بنیاد مل جل کر رہنا ہے ۔ تہذیب، تمدن اور حضارت مل جلکر رہنے سے ہی وجود میں آتی ہے ، اور اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ

انسان ایک دوسرے کی جانوں کا احترام کرے ۔اگر احترامِ جان ہی ختم ہوگیا تو گویا تمدن کی اساس ہی منہدم ہوگئی ۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کی بقا کے لئے لازم ہے کہ معاشرے کے اندر احترامِ جان کا پورا پورا اہتمام و التزام ہے ۔ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ ۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بہت محترم ٹھہرایا ہے ۔البتہ یہ شرط ہے کہ بعض ایسی صورتیں ہیں کہ جہاں کوئی شخص قانون کی زد میں آکر قتل کا مستوجب قرار پائے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا ۔

شریعت میں اس کی چار صورتیں ہیں پہلی یہ کہ قتلِ عمد کی صورت میں اگر مقتول کے وارث دیت یا خون بہا لینے کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں اور معاف کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو جان کے بدلے جان لی جائے گی : اِنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۔ دوسری یہ کہ کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے تو شریعت میں اس کے لئے سزا رجم ہے کہ اُس کو سنگسار کیا جائے تا آنکہ وہ ہلاک ہوجائے ۔ تیسری یہ کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے ۔ چوتھی یہ کا فر جو حربی ہو ۔جس کے ساتھ جنگ باقاعدہ ہو رہی ہو اعلانیہ جنگ ہو رہی ہو ۔ ذمّی نہیں ، معاذ اللہ ۔کسی اسلامی ریاست کا پرامن ذمی یا معاہد غیر مسلم نہیں ۔اسکی جان تو اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی مسلمان کی جان محترم ہے اُسے وہی تحفظات حاصل ہیں جو کسی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں ۔ البتہ جہاں کفّار و مشرکین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہو وہاں کا فر کی جان مومن کے لئے حلال ہوگی ۔۔ ان چار صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں انسانی جان کا لینا قتلِ ناحق ہوگا ۔۔ اور اس آیت مبارکہ کی رو سے قتلِ ناحق کے متعلق یہ جان لیجئے کہ دینِ اسلام کے نظام میں شرک کے بعد یہ سب سے بڑا جرم ہے ۔

تیسری بات فرمائی کہ : وَلَا یَزْنُوْنَ ۔ "اور وہ زنا نہیں کرتے" ۔ہم اس سے پہلے سورۃ مومنون اور سورہ معارج کی بعض آیات کے درس میں دیکھ چکے ہیں کہ اپنے شہوانی جذبات پر قابو پانے (SEX DISCIPLINE) کی کتنی اہمیت بیان ہوئی تھی ۔ دونوں سورتوں میں فرمایا : وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ہ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ ہ

یہاں وہی بات ہے لیکن اسلوب منفی ہے۔ وہاں مثبت پہلو سے بیان کیا کہ وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی شہوت پر قابو یافتہ ہیں، حلال راستہ کے علاوہ اپنی شہوت کی تسکین کے لئے کوئی حرام راستہ اختیار نہیں کرتے۔ یہاں وہی بات منفی اسلوب سے فرمائی: وَلَا یَزْنُوْنَ "اور وہ زنا نہیں کرتے"۔ البتہ یہاں جس سیاق (CONTEXT) میں یہ بات آئی ہے، اس سے ایک عظیم حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ قتل ناحق کے بعد سب سے بڑا جرم زنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ فعل بدرواج پا جائے اس میں سے اعتماد، باہمی محبت و الفت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ باہمی محبت کا سرچشمہ ایک شوہر اور اس کی بیوی کے مابین اعتماد کا احساس لازمی ہے۔ اگر یہ اعتماد ہے تو محبت بھی ہوگی، مودّت بھی ہوگی اور یہ خاندان اس دُنیا میں جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ کی کیفیت کا مظہر بن جائے گا۔ لیکن اگر کسی معاشرہ میں بدچلنی کا رواج ہو جائے، شوہر کو بیوی پر اعتماد نہ رہے، بیوی کا شوہر پر سے اعتماد اٹھ جائے۔ تو جس معاشرہ میں سے یہ باہمی اعتماد رخصت ہو جائے اور بے اعتمادی اسکی جگہ لے لے۔ اس معاشرے میں اعلیٰ اوصاف کبھی ترقی نہیں کریں گے۔ جو نئی نسل اس گھر میں پرورش پائے گی، اس میں حسنات اور اعلیٰ اخلاق کبھی بھی نشوونما نہیں پا سکیں گے بلکہ ایک منفی کردار پیدا ہو جائے گا۔ اُس نسل میں جو ایسے ماحول میں پرورش پا رہی ہو۔ تو گویا زنا وہ چیز ہے جو تمدّن میں حُسن و خوبی کے پھول کھلانے کے بجائے اُسے ایک متعفّن سنڈاس بنا کر رکھ دے گی۔ لہٰذا تیسری چیز ہے: وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ "اور وہ زنا نہیں کرتے"۔

سب سے بڑے ان تین گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ۔ جو کوئی ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے گا۔ شرک کرے گا، اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی حاجت روائی کے لئے پکارے گا۔ مشکل کشائی کے لئے پکارے گا، کسی اور کی بھی عبادت کرے گا۔ یا وہ انسانی جان ناحق لے گا، انسانی خون ناحق بہائے گا۔ یا وہ زنا کرے گا۔ تو وہ جان لے کہ اس کی پاداش اس کو بھگتنی پڑے گی: یَلْقَ اَثَامًا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ بچ نکلے گا۔ کوئی گرفت نہیں ہے، کوئی سزا نہیں ہے

اگر اس دنیا میں اُسے سزا نہیں ملی تو آخرت میں اُسے اس کا بھرپور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ آج کے درس کی پہلی آیت کا مطالعہ یہاں ختم ہوا۔ اگلی آیت میں فرمایا: یُضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۔ "قیامت کے دن اس کے لئے عذاب دُگنا کر دیا جائے گا"۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ عذاب بڑھتا چلا جائے گا، اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ بجائے اس کے کہ سزا اور عذاب میں تخفیف ہو کمی واقع ہو، اس کی تندی اور سختی میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے۔ غور کیجئے اس میں ایک لطیف نکتہ ہے۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ عذاب اُخروی اور یوم القیامہ سے قبل عالم برزخ کے عذاب یا بالفاظ دیگر قبر کے عذاب کی جو خبریں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہیں، قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تو ایسے سب حضرات کے لئے جو قرآن میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے عذاب قبر کو تسلیم کرنے میں متامل ہیں، یہ مقام بہت ہی لائق توجہ ہے فرمایا: یُضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ ۔ "دُگنا کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب قیامت کے دن"۔ اس سے آپ یہ بات نکل رہی ہے کہ قیادت کے دن سے پہلے بھی عذاب ہے۔ جس کو دگنا کرنے یا جس میں اضافہ کرنے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ عذاب ہے جسے ہم عذاب قبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کی خبر ہمیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں دی ہے اور یہ احادیث محدثین کے مقررہ کردہ سخت سے سخت معیار کے مطابق مستند اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں۔

اگر یہ اشکال ہو کہ ابھی قیامت کی عدالت تو لگی ہی نہیں، ابھی حساب کتاب اور وزن اعمال تو ہوا ہی نہیں تو اس سے پہلے سزا کیسی! ان کے اطمینان کے لئے یہ عرض ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے، اُسے خوب جانتا ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ۔ یہ آیت سورہ قیامہ میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ وہ طالب علم جس نے امتحان میں کچھ نہیں کیا، وہ جانتا ہے کہ اس نے پرچے کیسے کئے ہیں تو امتحان کا نتیجہ نکلنے اور DECLARE ہونے سے پہلے ہی اس کی جان سوکھتی رہتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری کارکردگی کیا ہے جس کا نتیجہ کے طور پر اعلان ہونے والا ہے۔ نتیجہ کے اعلان کے دن سے پہلے ہی وہ گویا ایک نوع کے کرب اور کوفت کی

کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو یہی ہے اصل حقیقت کہ اس دنیا سے اُس عالمِ آخرہ کی طرف منتقل ہونے کے فوراً بعد اُس چیز کا ایک عکس انسان کی رُوح پر پڑنا شروع ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے اس دُنیا میں کیا ہے۔ یہی ہے وہ بات جس کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں تعبیر فرمایا کہ "قبر یا جنّت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے"۔ اِدھر آنکھ بند ہوئی، اُدھر عالمِ برزخ میں آنکھ کھل گئی۔ اور اس میں انسان پر ان کیفیات کا ایک عکس پڑنا شروع ہو جاتا ہے جن سے اُسے بالآخر اپنے اعمال کی پاداش میں قیامت کے دن دوچار ہونا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے ایک حصہ میں کس قدر خوبصورتی سے اس طرف ایک لطیف اشارہ آگیا کہ: یُضٰعَفْ لَہُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ۔ قیامت کے دن تو عذاب دگنا ہو جائے گا۔ عذاب بڑھ چڑھ کر آئے گا، اور پھر انسان اس میں ہمیشہ ہمیش رہے گا: وَیَخْلُدْ۔ خلود، دوام اس کا مقدر ہو گا۔ فِیْہٖ مُھَانًا وہ اس میں رہے گا نہایت ذلیل و خوار ہو کر، رسوا ہو کر، اور یہ ذلت بھی دائمی ہو گی، اس سے رستگاری ممکن نہیں ہو گی۔

البتہ ایک استثنیٰ ہے۔ اگر انسان نے توبہ کر لی ہو تو بچت کی صورت ہے یہ چونکہ ایک مستقل مضمون ہے جو اِلَّا مَنْ تَابَ (آیت ۷۰) سے شروع ہو گا اور مَتَابًا (آیت نمبر ۷۱) پر ختم ہو گا تو ان شاء اللہ اس پر اگلی نشست میں گفتگو ہو گی۔ آج ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ ان دو آیاتِ مبارکہ میں حکمتِ دین کا ایک اہم باب ہمارے سامنے آیا۔ یہ کہ قرآن مجید کی رو سے ہمارے دین میں عظیم ترین گناہ کون سے ہیں جن کی پاداش انسان کو لازماً بھگتنا پڑے گی، عالمِ برزخ میں بھی اور عالمِ آخرہ میں بھی۔

آج جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کے بارے میں کوئی سوال ہے یا اشکال ہے۔ تو حاضر ہوں۔

سوال و جواب

سوال: ڈاکٹر صاحب! کیا گناہ کبیرہ کا مرتکب مسلمان رہ سکتا ہے؟

جواب: یہ بہت اہم سوال ہے۔ اس کے دو رُخ ہیں۔ بعض احادیث سے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ انسان حالتِ ایمان میں گناہ نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک متفق علیہ روایت ہے یعنی صحیح بخاری میں بھی ہے اور صحیح مسلم میں بھی۔ اور اس کے راوی حضرت ابوہریرہؓ ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ جس کی رو سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا یَزْنِی الزَّانِی حِیْنَ یَزْنِی وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَسْرِقُ السَّارِقُ حِیْنَ یَسْرِقُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ وَلَا یَشْرَبُ الْخَمْرَ حِیْنَ یَشْرَبُ وَھُوَ مُؤْمِنٌ "کوئی شخص حالتِ ایمان میں زنا نہیں کرتا، کوئی شخص حالتِ ایمان میں چوری نہیں کرتا، کوئی شخص حالتِ ایمان میں شراب نہیں پیتا" یعنی جس وقت وہ ان میں سے کوئی گناہ کر رہا ہوتا ہے اُس وقت ایمان اُس کے دل میں نہیں ہوتا۔ تو ایک طرف اس نوع کی متعدد احادیث ہیں۔ دوسری طرف ہمیں یہ حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے اور یہ بھی قرآن مجید سے اور احادیث نبویہ سے سامنے آتی ہے کہ گناہ کبیرہ سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہو جائے گا" بلکہ اُسے مسلمان ہی سمجھا جائے گا اگرچہ وہ ایک فاسق و فاجر مسلمان ہے۔ چنانچہ یہی موقف ہے امام اعظم امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کہ گناہ کبیرہ سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہو جاتا۔ ان دو چیزوں میں تطبیق یہ ہے کہ ایک ہے قانونی ایمان جس کی بنیاد پر ہم دُنیا میں کسی کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ اس کی بات بالکل علیحدہ ہے۔ ایک ہے قلبی کیفیت اور قلبی یقین والا ایمان۔ اس کی بات بالکل دوسری ہے۔ چنانچہ گناہ کبیرہ کے ارتکاب پر اس دُنیا میں کسی کو کافر قرار نہیں دیا جائے گا۔ قانونی طور پر وہ مسلمان اور مومن تسلیم کیا جائے گا۔ البتہ حقیقتِ ایمان کے اعتبار سے غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر دل میں یقین ہو کہ اللہ ہے اور وہ مجھے دیکھ رہا ہے تو گناہ کا صدور کیسے ہوگا! یہ بات دو اور دو چار کی طرح منطقی و یقینی نظر آتی ہے کہ قلبی یقین والے ایمان کے ہوتے ہوئے ایک مسلمان گناہ نہیں کر سکتا۔ تو یہ دونوں چیزیں بیک وقت درست ہیں اور دونوں کو بیک وقت اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ پہلی سے اُمید پیدا ہوتی ہے، رجا پیدا ہوتی ہے۔ دوسری طرف سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں اپنے اپنے محل و مقام پر درست ہیں۔

سوال: ڈاکٹر صاحب! آپ نے قبر کے عذاب کا ذکر کیا ہے تو کچھ لوگ جلا دیئے

جاتے ہیں، کچھ سمندر میں غرق ہو جاتے ہیں اور ان کی لاشیں نہیں ملتیں ان کو دفنایا نہیں جاتا تو ان کو قبر کا عذاب کیسے ملے گا۔

جواب : اصل میں لفظِ قبر استعارہ ہے عالم برزخ کے لئے چونکہ عظیم تعداد ایسے ہی لوگوں کی ہے جو دفن کئے جاتے ہیں اور ان کی ایک قبر وجود میں آتی ہے۔ مزید یہ کہ عرب لاش کو 'DISPOSE OFF' کرنے کے اسی طریقہ سے واقف تھے۔ لہٰذا لفظِ قبر ہی احادیث میں استعمال ہوا۔ لیکن اس سے مراد ہے عالم برزخ۔ یہ عالم اس ہماری دنیا اور عالم آخرہ کا درمیانی عرصہ ہے۔ اس عالم برزخ کو استعارۃً قبر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ چاہے کوئی شخص سمندر میں غرق ہو کر مرا ہو اور ہو سکتا ہے کہ کسی وھیل مچھلی کا پیٹ اس کی قبر بنے، خواہ کسی کو کوئی درندہ چیر پھاڑ کر چٹ کر گیا ہو۔ اور اس کا پیٹ اس کی قبر بن گئی ہو۔ خواہ کسی کی لاش کو جلا دیا جائے یا وہ حادثہ کے طور پر جل کر مر جائے اور اس کی راکھ پانی میں بہا دی جائے یا ہوا میں اڑا دی جائے۔ تو ان تمام شکلوں سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ عالم برزخ میں انکی ارواح کو تو جانا ہی جانا ہے اور جس عذاب کو ہم عذاب قبر سے تعبیر کرتے ہیں، وہ درحقیقت عالم برزخ کا عذاب ہے۔

حضرات! آج جو مضمون ہمارے سامنے آیا ہے، وہ عملی اعتبار سے نہایت اہم ہے۔ اچھی طرح جان لیجئے کہ جن کبیرہ گناہوں کا یہاں ذکر ہوا ہے، ان میں سے کسی کا بھی خیال کسی بندہ مومن و مسلم کے دل و دماغ میں نہیں آنا چاہیئے۔ یعنی وہ کسی نوع کے شرک میں مبتلا ہو، یا ناحق کسی کا خون بہائے یا زنا کی طرف اس کا خیال بھی جائے اس میں ہلاکت ہی ہلاکت اور بربادی ہی بربادی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان تینوں کبیرہ گناہوں سے مجتنب رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اردو ڈائجسٹ ۱۵۷ ستمبر ۱۹۸۹ء

"یہ گریہ وزاری تو رحمت ہے۔ جو دوسروں پر رحم محسوس نہیں کرتا اُس پر رحم کیا بھی نہیں جاتا۔ میں نے لوگوں کو جو روکا ہے وہ بے جا نوحہ وزاری ہے اور اس بات سے کہ وہ مُردے کی ان صفات پر نالہ وزاری کریں جو اُس میں نہ ہوں۔"
پھر اپنے دل کے ٹکڑے ابراہیم کو مخاطب کر کے فرمایا:
"ہم جانتے ہیں کہ موت تو امرِ حق ہے اور وقت پر اس کا آنا یقینی ہے۔ ہم اس امر سے بھی واقف ہیں کہ پیچھے رہ جانے والے بھی پہلے جانے والوں کے ساتھ جا ملیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تمہارے جانے کا غم اور بھی زیادہ ہوتا۔ آنکھیں آنسو برسا رہی ہیں، دل غمزدہ ہے مگر ہماری زبان سے وہی نکلے گا جو ہمارے رب کو پسند ہے۔ اے ابراہیم، ہم تمہاری جُدائی سے غمگین ہیں۔" (بخاری)

THE ROARING LION OF AGRO-CHEMICAL INDUSTRY

BUBBER SHER UREA ®

THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS, AND THERE ARE PEOPLE WHO DO THINGS WELL.

AT DAWOOD HERCULES WE DO THINGS WELL ! RIGHT FROM OUR INCEPTION 12 YEARS AGO WE'VE BEEN ENGAGED IN A TREMENDOUS OUTPUT, ENSURING BETTER AND HEALTHIER CROPS AND STRENGTHENING THE NATIONAL ECONOMY. DURING THIS TIME WE'VE :

a. PRODUCED 4,000,000 TONS OF BUBBER SHER UREA.
b. SAVED MORE THAN US $ 750,000,000 IN FOREIGN EXCHANGE FOR PAKISTAN.
c. CONTRIBUTED RS. 2000,000,000 TO THE NATIONAL TREASURY IN THE FORM OF DEVELOPMENT SURCHARGE, DUTIES AND TAXES.
d. SAVED FERTILIZER SUBSIDY WORTH RS. 3000,000,000 IN OUR PRODUCTION WHICH WAS USED BY THE GOVERNMENT TO SUBSIDIZE FERTILIZER PRICES. GIVING AN ENORMOUS BENEFIT TO THE FARMER.

BROADLY SPEAKING WE ARE COMMITTED TO A BETTER QUALITY OF LIFE FOR OUR PEOPLE AND WE ARE DEVOTING OUR VAST TECHNOLOGICAL RESOURCES AND AGRO-CHEMICAL KNOW-HOW TO PROVIDING A VITAL INPUT FOR DEVELOPING HEALTHIER CROPS.

WE FEEL PROUD OF THESE ACHIEVEMENTS, AND SHALL CONTINUE TO PLAY OUR KEYROLE IN THE DEVELOPMENT OF AGRICULTURE AND ECONOMY OF PAKISTAN.

dh CHEMICALS

DAWOOD HERCULES CHEMICALS LIMITED
MAKERS OF BUBBER SHER UREA

DAWOOD CORPORATION LIMITED
DISTRIBUTERS OF BUBBER SHER UREA

promoters

تعزیتی خطوط

مکتوبِ گرامی حضرت مولانا سیّد ابُوالحسن علی ندوی

رائے بریلی
۱۵ ربیع الاول ۱۴۰۷ھ

محب گرامی منزلت ڈاکٹر صاحب زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ "میثاق" کا شمارہ ۱۱ جلد ۳۵ (ربیع الاوّل ۱۴۰۷ھ) پہنچا۔ اس سے آپ کے خاندان بلکہ خاص گھر کے حادثۂ فاجعہ کا تفصیلی علم ہوا۔ ستمبر سے لے کر وسط نومبر تک میں تقریباً مسلسل بیرونی و اندرونی سفروں اور دوروں پر رہا، اسی وجہ سے یہ اہم تعزیتی مکتوب لکھنے کی نوبت بہت تاخیر سے آرہی ہے، حادثہ ایسا اندوہناک ہے کہ اس کے لیے تعزیتی لفظ ملنے مشکل ہیں، لیکن آپ نے خود ہی "عرضِ احوال" کے مضمون میں اپنے رضا بالقضا، قوتِ ایمانی و مطالعہ قرآنی کا جو اظہار فرمایا ہے وہ صبر و تسکین کے الفاظ لکھنے سے بہت حد تک مستغنی کر دیتا ہے۔ میں اپنے دو جواں مرگ لائق و سعید بلکہ قوتِ بازو عزیزوں (محمد الحسنی مرحوم مدیر رسالہ "البعث الاسلامی" اور مولوی سید محمد ثانی مرحوم مصنّف کتب کثیرہ و مدیر رسالہ "رضوان") کی وفات کا صدمہ اٹھا چکا ہوں جن میں سے اوّل الذکر میرے حقیقی بھتیجے اور ثانی الذکر حقیقی بھانجے تھے، اور دونوں میرے علمی، تصنیفی، دعوتی اور خانگی امور میں دستِ راست تھے، اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ ایسے موقع پر کیا ابتلاء پیش آتا ہے، اور صبر و رضا بالقضاء کا کیسا امتحان ہے۔

آپ میرے اور میرے رفقاء و اعزہ کی طرف سے دلی تعزیت قبول کیجئے، اس وقت آپ کا دل مجروح اور شکستہ ہے، اور حدیث قدسی ہے "أنا عند المنکسرۃ قلوبھم" اس لیے آپ کی دعا بھی انشاء اللہ قبول و مؤثر ہوگی، آپ ہم سب کے لیے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے دعا کیجئے۔

مرحوم حمید احمد کے شیر خوار بچے سیّد احمد کو اللہ تعالیٰ اس نام کی برکت عطا فرمائے اور وہ اپنے والد شہید کا نعم البدل اور اسم بامسمّیٰ ثابت ہوں۔ محترمی اللہ بخش سیال صاحب اور محترمی اقتدار احمد صاحب سے بھی سلام کہیے اور تعزیت کیجئے، خدا کرے آپ کا مزاج بخیر ہو۔

والسلام
مخلص ابوالحسن علی

مکتوب گرامی ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی، پشاور

محترمی زادعنایتہ

السلام علیکم

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میری طبیعت اب کمزور رہتی ہے۔ یہ عمر کا تقاضا ہے۔ کاروان زندگی ۸۹ کی منزل میں ہے۔ اور ارذل العمر کا مرحلہ ہے مگر زندگی عطیہ خداوندی ہے لہٰذا اس کو بسر کرنا ہی پڑتا ہے۔ دُعا فرمائیں کہ یہ رضاء الٰہی ہی میں بسر ہو جائے۔

ماہ نومبر ۸۶ء کے "میثاق" میں جو "تاثرات" عرضِ احوال کے تحت بضمن حادثۂ فاجعہ آپ نے تحریر فرمائے۔ وہ حد درجہ فکر انگیز اور سبق آموز ہیں۔ اور یہ آپ کا ہی حصہ اور حوصلہ ہے کہ آپ اس منزل سے باحوصلہ و باوقار طور سے گزرے۔

آپ کو خدا نے جن صلاحیتوں سے نوازا اور پھر ان صلاحیتوں کو دعوت قرآن میں صرف فرمایا ہے ہیں اُس کی ایک تاریخ بھی ہے اور پس منظر بھی اور اس کو آپ نے بطور تحدیث نعمت بیان بھی کر دیا ہے۔ یہ انعام خداوندی ہے۔ جس کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تصنیف "تذکرہ" میں یوں تحریر فرمایا:۔

"اللہ تعالےٰ نے اُن نعمتوں میں سے جن کے ذریعے وہ اس دنیا میں اپنے بندوں کو سعادت بخشتا ہے۔ ایک بڑی نعمت "آباءِ صالحین" کے لئے یہ ہے۔ کہ اولادِ صالح عطا فرمائے کہ "رب ھب لی من الصالحین" اور "وھبنا لہ اسحٰق ویعقوب کلاً ھدینا" اور اولاد کے لئے یہ ہے کہ والدین صالح ہوں (سورہ کہف) صاحب موسیٰ علیہ السلام نے ایک گری ہوئی دیوار کو جن کو یتیموں کے دفینہ کی حفاظت کی تو فرمایا: "وکان ابوھما صالحا"، اور حضرت یوسف کی نسبت آنحضرتؐ نے فرمایا: "انما الکریم ابن کریم، ابن الکریم، ابن الکریم، ابن الکریم" اور یہ ظاہر ہے کہ کسی خاندان میں عرصہ تک علم و صلاح کا باقی و جاری رہنا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ان دو نعمتوں سے فیض یاب ہو۔ آباء کو اولاد صالح اور اولاد کو آباء صالح نصیب ہوں"

آپ کے خاندان میں بھی یہ شرف چار پشتوں تک چلتا دکھائی دیتا ہے۔ اللّٰھم زد فزد۔ اور آپ کے خاندان سے دو عزیزان کا حادثاتی موت (شہادت) سے دوچار ہونا، مزید عظمت کی نشانی ہے۔

آپ نے دیار مغرب میں مکین ہو جانے والے افراد کے متعلق تحریر فرمایا:

"اوّل تو ان لوگوں کو مراجعت وطن پر آمادہ کرنا ہی محال ہے اور اس کے ثبوت میں میں علامہ اقبال کا قول نقل فرمایا:۔

ہم مشرق کے مسکینوں کا دل مغرب میں جا اٹکا ہے
واں کنٹر سب بلوری ہیں، یاں ایک پرانا مٹکا ہے

یہ یقیناً ٹھیک تجزیہ ہے۔

اور امریکہ میں ایک مقیم ڈاکٹر صاحب کا مقولہ "یہ امریکی لوگ، افریقہ کے لوگوں کو تو لوہے کی زنجیروں میں باندھ کر یہاں لائے تھے اور ہمیں انہوں نے یہاں سنہری زنجیروں میں جکڑ دیا ہے" اور معلوم ہے کہ سونے کی زنجیر لوہے کی زنجیر سے قوی تر ہوتی ہے بلکہ دولت و محبت کی زنجیر تو کچے دھاگے میں بندھی آئے گی سرکار میری" والا معاملہ ہے۔

اور پھر آپ کا فرمانا کہ "کہ جو لوگ ہمت کر کے وہاں سے واپس آ جاتے ہیں متعدد مثالیں اس کی موجود ہیں کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود اور شدید مالی نقصان کے علی الرغم، یہاں کے اس دفتری اور کاروباری ماحول کے ساتھ کسی طرح سازگاری اختیار نہ کر سکے جس میں قدم قدم پر رشوت، سفارش ہی نہیں، دھوکا، فریب، جانبداری اور کنبہ پروری اور ان سب پر مستزاد ایک دوسرے کی ٹانگیں گھسیٹنے اور پیٹھ پیچھے برائی کا جال بچھا ہوا ہے لہٰذا انہیں بصد حسرت دیاس دوبارہ وطن عزیز کو خیرباد کہتے ہی بنی"

یہ المیہ عام ہے۔ میں خود بھی اس المیہ کی زد میں ہوں۔ میں تین بیٹوں کا باپ ہوں، اور وہ سب امریکہ، سویڈن اور انگلینڈ میں عرصہ سے مقیم اور وہاں خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ بلکہ ارضِ جنت میں وقت گزار رہے ہیں۔ وہاں ہی شادیاں کر لی ہیں۔

میں نے اپنی تنہائی کی زندگی کی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے انکو واپس آنے پر مجبور کیا پہلے بڑا - جو ڈاکٹر ہے آیا - دو سال یہاں رہا - لیکن بوجوہ متذکرہ بالا، مجبوراً اس کو واپس جانا پڑا - اس کے بعد دوسرا بیٹا جو انجینئر ہے اور سویڈن میں تھا - بمعہ سویڈش بیوی اور بچوں کے ساتھ یہاں آیا - پانچ سال یہاں رہا - محنت کی - دولت خرچ کی، اور ایک چھوٹا سا کارخانہ بنانے میں کامیاب بھی ہو گیا - لیکن وطن عزیز میں قدم قدم پر، حد سے بڑھی ہوئی رشوت نے اُس کو بے دم کر دیا - اور بنا بنایا کارخانہ چھوڑ کر واپس جانے پر مجبور ہو گیا - میں ان دونوں بیٹوں کی بے کسی نہ دیکھ سکا اور اُن کو واپس جانے کی اجازت دے دی کیوں کہ وہ دونوں عزّت نفس اور خودی کے زیاں کو برداشت نہ کر سکے -

زمانہ کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو - کہ یہ ملک جو علامہ اقبالؒ کہ نظریہ خودی کے تحت ظہور میں آیا - اور اسلام کے نام سے موسوم ہُوا - اُس میں جس بے دردی و شقاوت کے ساتھ عزّتِ نفس و جذبہ خودی پامال ہو رہا ہے - اس کی مثال نہیں ملتی -

پاکستانی دُعا تو پانچ وقت یہی کرتا ہے ربّنا اٰتنا فی الدُنیا حسنۃ وّفی الاخرۃ حسنۃ - لیکن یہ دُعائیں کس طرح منظور ہو سکتی ہیں جہاں رشوت کا بازار سرِعام گرم ہو - اور حضورؐ کی حدیث مبارک ہے - "رشوت لینے والا - رشوت دینے والا - اور رشوت کا دلال - سب جہنّمی ہیں"

ان حالات میں حیرت کا مقام ہے - کہ ہر سو ایمانیات (عقیدہ) پر بحثیں ہیں جدل ہے سر پھٹول ہے - لیکن معاملات (اعمال) پر کوئی نقد و نظر نہیں - حالانکہ اعمال صالحہ پر ہی ایمانیات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے - اور انہی میں کد و کاوش کی ضرورت ہے - خاص کر اس زمانہ میں -

ایمانیات کے متعلق ایک بات کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں

ایک صحرا نشین بدّو تھوڑی دیر کے لئے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا اور پوچھتا تھا - "نجات کا طریقہ کیا ہے"؟ آپ اُس کے جواب میں کہتے "پانچ باتیں" "شہادتین کا اقرار اور نماز، روزہ، حج زکوٰۃ کے اعمال" وہ اقرار کرتا تھا اور یہ پکارتا ہوا واپس چلا جاتا تھا - "واللہ لا ازید ولا انقص" آپؐ اُس کی پیٹھ کی طرف

اشارہ کرکے کہنے جو کوئی نجات یافتہ انسان کو دیکھنا چاہتا ہے وہ اس بڈو کو دیکھ لے"
آخر میں آپ کی حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی سے صلح وصفائی پر
تہ دل سے مبارک عرض کرتا ہوں - اور اس کو قران السعدین جانتا ہوں -
اس طویل سمع خراشی کے لئے معافی چاہتا ہوں -

بہ حرفے مے تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوقِ حضوری، طول دادم داستانے را

میں عمر کی آخری منزل میں تنہائی کی اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیٹی کے
ہاں - ۷۔چنار روڈ - یونیورسٹی ٹاؤن پشاور - آگیا ہوں ، اور اس کی مخلصانہ
خدمت سے ، زندگی کا یہ عرصہ بڑے آرام سے گزار رہا ہوں - میرے لئے خاتمہ بالخیر
کی دُعا فرمائیں - والسلام طالب دُعا شیر بہادر پنی

خصوصی رعایتی پیشکش

ماہنامہ میثاق لاہور ۸۶ء کی مکمل فائل

- ۱۲ شمارے ، مضبوط دیدہ زیب جلد میں
  ہدیہ -/۴۰ روپے
- ۱۲ شمارے ، گتے کے مضبوط کور میں
  ہدیہ -/۳۰ روپے

نوٹ : مذکورہ قیمت میں ڈاک خرچ شامل نہیں ہے -

طلب فرمائیں :

مکتبہ تنظیمِ اسلامی ، ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴
فون : ۸۵۲۶۸۳

روشن چہرے

صبرِ جمیل کی کہکشاں

آنکھوں نے پچھلے دنوں کچھ ایسے مناظر دیکھے جنہوں نے قرونِ اولیٰ کی یاد تازہ کردی۔

حافظ افروغ حسن

عبداللہ طاہر سیال کے ماں باپ منڈی صادق آباد میں مقیم ہیں۔ وہ کچھ دنوں سے اُن کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ ۲۲ ستمبر ۱۹۸۶ء کو اس نے اپنے ماموں زاد بھائی حمید احمد کو اپنے ساتھ صادق آباد چلنے پر آمادہ کر لیا۔ پروگرام کے مطابق دونوں بھائی ۲۴ ستمبر کو علی الصبح ساڑھے چار بجے لاہور سے روانہ ہوئے۔ کار وہ خود چلا رہے تھے۔ دس بجے کے قریب کبیر والا پہنچے۔ یہاں طاہر کے چچا محمد نواز سیال رہتے ہیں۔

کبیر والا میں دونوں بھائیوں نے آرام کیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور دو بجے کے قریب پھر سفر پر روانہ ہو گئے۔ جب اُن کی کار دُنیاپور کے قصبے کے چوراہے کے قریب پہنچی تو بائیں جانب سے سامان سے لدا ہوا ایک تیز رفتار ٹرک آیا۔ ٹرک اور کار کی پوزیشن اُس لمحے کچھ ایسی تھی کہ اُن میں تصادم یقینی تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے کار کو حادثے سے بچانے کے لیے ایک دم بریک لگا دی۔ بریک لگاتے ہی ٹرک ایک سمت دھماکے کے ساتھ اُلٹ گیا اور اُسی کار پر جا گرا جسے بچانے کے لیے ڈرائیور نے بریک لگا کر ایک ہولناک خطرہ مول لیا تھا۔

یہ ناگہانی تصادم اتنا خوفناک تھا کہ کار میں سوار دونوں نوجوان موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔ کار بُری طرح کچلی گئی تھی اور اُس میں جسم دھنس اور پھنس گئے تھے۔ مقامی پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ گاڑی کے کاغذات سے اُسے یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی کہ حادثے میں ہلاک ہونے والے نوجوان کون ہیں اور اُن کا تعلق کس خاندان سے ہے؛ چنانچہ حادثے کی اطلاع بذریعہ ٹیلیفون اہلِ خاندان کو لاہور بھی دے دی گئی اور صادق آباد میں بھی۔

یہ سانحہ اتنا درد انگیز تھا کہ اس کی خبر سنتے ہی انسان تڑپ کر کانپ اُٹھتا تھا۔ تقریباً شام سات بجے اس کی اطلاع عزیزم سعادت اعجاز نے مجھے اچھرے میں دی۔ سنتے ہی تمام جسم لرز گیا۔ اوسان خطا ہو گئے۔ محسوس ہوتا تھا کہ دل و دماغ کی مشینری نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ رگوں میں خون کی گردش رک گئی ہے اور تمام اعصابی نظام معطل ہو گیا ہے۔

عبداللہ طاہر سیال جو اکتیس سالہ نوجوان تھا، انجینئرنگ میں اُس کی قابلیت اور مہارت قابلِ رشک تھی۔ قدرت نے اُسے ذہانت و فطانت کی نعمتوں سے فیاضی کے ساتھ نوازا تھا۔ سیرت و طبیعت اسلامی سانچے میں ڈھلی ہوئی۔ چہرے پر سیاہ مگر نورانی ڈاڑھی کے ساتھ ساتھ متانت اور سنجیدگی کارفرما رہتی۔

یہ نوجوان اللہ بخش سیال کا لختِ جگر، ڈاکٹر اسرار احمد کا حقیقی بھانجا اور اُن کے چھوٹے بھائی اقتدار احمد کا داماد تھا۔ اللہ نے اُسے پانچ بچے بھی عطا کر دیے تھے۔

دوسرا نوجوان حمید احمد جس کی عمر صرف چوبیس سال تھی اقتدار احمد کی آنکھوں کا نور اور ڈاکٹر اسرار احمد کا داماد تھا۔ ننھے منے دو معصوم بچوں کی پرورش و تربیت کی ذمے داری بھی ربِ کریم نے اُس کے سپرد کر دی تھی۔ یہ نوجوان اعلیٰ درجے کی ذہنی، فکری، عملی اور فنی صلاحیتوں سے آراستہ اور اسلامی اخلاق کی دلنواز خوبیوں سے پیراستہ تھا۔ چہرے پر چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی دل کے اُس جذبۂ صادق کی علامت تھی کہ سُنتِ رسولؐ کی اتباع ہی ایک مسلمان کی زندگی کا سب سے اہم اور مقدس مشن ہے۔

اس دلگداز المیے کی خبر سن کر میں فوراً برادرِ محترم حاجی گل حسن صاحب کے ہمراہ اقتدار احمد کے مکان افغانی روڈ سمن آباد پہنچا۔ وہاں خاندان کے سبھی افراد جمع تھے۔ ان سوگواروں میں مرحوم حمید احمد کے والد، تایا، چچا اور بھائی بھی موجود تھے۔ صبر کا دامن تھامے ہوئے مشیتِ ایزدی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے کرب و اضطراب اور غم و اندوہ کے آثار چہروں پر نمایاں ضرور تھے مگر کیا مجال کہ زبان سے بے چینی اور

بے قراری کا ایک لفظ بھی ادا ہُوا ہو یا کوئی اضطراری حرکت سرزد ہوئی ہو۔

غم و کرب کی یہ سیاہ اور تاریک رات گھر والوں نے جس طرح گذاری اسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ تقریباً چار بجے صبح نوجوانوں کی لاشیں گھر پہنچیں۔

یہ وہی وقت تھا جب یہ دونوں نوجوان ایک دن پہلے اپنے گھروں سے خوشی خوشی سفر پر روانہ ہوئے تھے اور آج چوبیس گھنٹوں بعد واپس آئے تو پُورا ماحول سوگوار تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل بے قرار تھا۔ ایسے موقع پر بڑے بڑے حوصلہ مند انسانوں کے ہاتھ سے صبر و ضبط کا دامن چھوٹ جاتا ہے ـــــ مگر گھر والوں نے جس ضبط و تحمل اور صبر و تسلیم کا مظاہرہ کیا وہ ایک عام آدمی کے لیے حیرت ناک بھی تھا اور سبق آموز بھی۔

ان جوانمرگ نوجوانوں کی میتوں کو اُن کے بزرگوں اور عزیزوں نے خود غسل دیا۔ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے نزدیک یہی پسندیدہ اور مستحسن طریقہ ہے۔ حادثے کی شدت نے جسم بُری طرح کچل دیے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھے۔ غم کی شدت سے کلیجے مُنہ کو آ گئے۔ رنج اور الم کی بے پایاں تپش سے دل پگھل کر آنکھوں کے راستے بہنے لگے مگر زبانیں خاموش تھیں اور غسل دینے اور کفنانے کے سارے مراحل پُورے سکون و قرار سے پُورے ہُوئے۔

تقریباً صبح سات بجے طاہر سیال کے ماں باپ بھی پہنچ گئے۔ یہ پہلے صادق آباد میں اپنے بیٹے کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ جب وہ نہ پہنچا تو اُسے ملنے خود لاہور آ گئے۔ وہ صرف ملنے ہی نہیں اُسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے آئے تھے، کیونکہ اُس کے مالک نے اُسے واپس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور امین کا کام ہی یہ ہے کہ جب اُس سے امانت واپس طلب کی جائے تو اسے ادا کرنے اور واپس دینے میں کسی قسم کے عذر اور ہچکچاہٹ سے کام نہ لے۔

عبداللہ طاہر سیال کے والد اللہ بخش سیال سے ملاقات ہُوئی۔ جوان بیٹے کی اچانک اور حادثاتی موت کے اس کرب ناک اور دردناک موقع پر صبر و قناعت اور توکّل علی اللہ کے مومنانہ طرزِ عمل نے اُن کے چہرے کو نُورانی بنا دیا تھا۔

ساڑھے نو بجے اس گھر سے بیک وقت دو نوجوانوں کے جنازے اُٹھے۔ یہ وقت قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر گھروں میں محشر سا بپا ہو جاتا ہے۔ گریہ و زاری، آہ و بکا اور نالہ و شیون کا ایک ایسا شور اُٹھتا ہے کہ پتھروں کے دل بھی پھٹ پڑتے ہیں مگر اس گھر کے مکینوں اور سوگواروں نے اس نازک اور جان لیوا موقع پر جس ضبط و تحمل، بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا ثبوت دیا وہ دیدنی بھی تھا اور قابلِ اتباع بھی۔ آہوں کا شور نہ شکوہ و شکایت کی فلک شگاف چیخیں۔ ماتم کی صدائیں نہ سینہ کوبی کی آوازیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ امانتیں مالک کے حوالے کرنے کا عمل بڑے سلیقے اور وقار سے انجام پا رہا ہے۔

اس گھر کی خواتین نے جو مثالی کردار ادا کیا وہ قابلِ تحسین ہے اور لائقِ رشک بھی۔ ان غمزدہ اور سوگوار عورتوں میں اللہ کو پیارے ہو جانے والے نوجوانوں کی مائیں بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ خالائیں بھی تھیں اور بہنیں بھی۔ بیویاں بھی تھیں اور پھوپھیاں بھی۔ ان سب کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلِ رواں اُمڈا ہُوا تھا جو درد و غم سے چُور دلوں کا ترجمان تھا۔ وہ سب کی سب مجسّمۂ صبر اور پیکرِ تسلیم و رضا بنی ہُوئی تھیں۔

صبر و ضبط اور تحمل و بُردباری کے محیّر العقول واقعات تاریخ کے اوراق میں پڑھے ضرور تھے مگر آنکھوں سے ایسے مناظر دیکھنے کا موقع کم ہی ملا تھا۔ ماتم کی مجلس میں ایمان پرور مناظر دیکھ کر اس یقین میں پختگی اور گہرائی پیدا ہو گئی کہ اسلام کے نظریے، اُس کے فلسفے اور اُس کے عقیدے میں ایک ایسی معجزانہ قوت ہے کہ جو اسے سوچ سمجھ کر اپنا لیتا ہے تو اُس کی رُوح میں وہ بالیدگی، اُس کے دل میں وہ ہمت و وسعت، اُس کے ذہن میں وہ ارجمندی اور اُس کے جسم میں وہ توانائی پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر وہ سخت سے سخت آزمائش اور شدید سے شدید مصائب کا پامردی اور حوصلہ و جُرأت سے مقابلہ کرنے کی اپنے اندر سکت بھی پاتا ہے اور سلیقہ بھی۔ کچھ یہی حالت اس گھر کے مکینوں اور سوگواروں کی تھی۔

صبرِ جمیل کی اس بے مثل کیفیت پر دل کی آنکھیں کسی حجاب کے بغیر یہ مشاہدہ کر رہی تھیں کہ قرآن مجید کی بشارت ان گھر والوں کی بلائیں لے رہی ہے اور مدبھرے سُروں میں بلند ترین مراتب و انعامات کا مژدہ سُنا رہی ہے۔ کتنی پیاری اور جاں نواز ہے یہ بشارت!

"اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے۔ انہیں خوشخبری دے دو۔ اُن پر اُن کے رب کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی، اُس کی رحمت اُن پر سایہ کرے گی اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔" (سورہ بقرہ)

اس موقع پر دل کی گہرائی سے یہ دُعا نکل رہی تھی کہ الٰہ العالمین جس طرح ان نوجوانوں کے لواحقین نے صبرِ جمیل کا دامن مضبوطی سے تھام کر تیری رحمت کو دعوت دی ہے، اسی طرح تُو ان کی اچانک اور گھائل موت کو شہادت کا اعلیٰ ترین مرتبہ اور اعزاز عطا فرما اور جنت الفردوس کی نُورانی اور شاداب بہاروں کو ان کا مسکن بنا جیسا کہ شہداء کے متعلق خود تیرا اعلان ہے:

"جو شخص اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں، انہیں مُردہ نہ کہو۔ وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں۔ اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔ جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں اور مطمئن ہیں کہ جو اہلِ ایمان اُن کے پیچھے دُنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں، اُن کے لیے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اُس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور اُن کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔" (سورہ آلِ عمران)

اسلام کے سایۂ عاطفت میں آجانے والا خوش قسمت انسان اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ہدایت و رہنمائی کے لیے جس ذات کی طرف دیکھتا ہے وہ اللہ کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکت ہے۔ غم ہو یا خوشی، امن کا دَور ہو یا میدانِ کارزار، خاندان اور رشتے داروں کے معاملات ہوں یا قومی سطح کے سیاسی امور، ہر معاملے اور ہر شعبے میں اسی ذاتِ اقدس کی تعلیم اور ہدایت سرچشمۂ فیض و برکت ہے۔ اسی در سے دلوں کو سکون و قوت اور عملی زندگی کو راستی و ہمواری نصیب ہوتی ہے۔

انسانیت کے اس محسنِ اعظم کی حیاتِ مبارکہ میں بھی ایسے واقعات رُونما ہوئے جب موت نے آپؐ کے چہیتے عزیز اور دل کے ٹکڑے آپ سے چھین لیے، آپ پر غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ایسے مواقع پر آپؐ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اور اپنی اُمت کے سامنے جو نمونہ پیش کیا اُس کی اتباع پُوری اُمت کے لیے موجبِ سعادت اور باعثِ رحمت ہے۔ ان کی چند جھلکیاں پیشِ خدمت ہیں:

حضرت حمزہؓ کی شہادت

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضورؐ کے چچا، ہم عمر اور دُودھ شریک بھائی تھے۔ غزوۂ اُحد میں خدا کی راہ میں بہادری اور جرأت سے لڑتے لڑتے شہید ہو گئے۔ دشمنوں نے شقاوت اور بدبختی کی حد کر دی، جوشِ انتقام میں آپ کے جسم کا مُثلہ کیا اور کلیجہ چبایا۔ حضورؐ اپنے محبوب چچا کے جسم کی یہ حالت دیکھ کر شدتِ غم سے حُزن و ملال کی تصویر بن گئے۔

حضرت صفیہؓ کو اپنے بھائی کی شہادت اور لاش کے ساتھ کافروں کے بہیمانہ سلوک کی اطلاع ملی تو وہ مدینے سے خود میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ حضورؐ نے اُن کے بیٹے حضرت زبیرؓ کو ہدایت کی کہ بہن اپنے بھائی کی لاش نہ دیکھنے پائے۔ آپؐ کا یہ پیغام سُن کر بولیں کہ مجھے اپنے بھائی کے متعلق تمام حالات کا علم ہو چکا ہے لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں۔ حضورؐ کی طرف سے اجازت ملنے پر لاش پر گئیں۔ خُون کا جوش تھا، پیارے بھائی کے ٹکڑے بکھرے ہُوئے تھے۔ فرطِ الم سے تڑپ اُٹھیں لیکن زبان سے صرف اتنا کہا:

"ہم سب اللہ کے لیے ہیں اور اُسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔"

اس جنگ میں حضورؐ کے ستر جاں نثار ساتھی کام آئے تھے، اس لیے آپؐ جب تشریف لائے تو پُورا شہر ماتم کدہ بنا ہُوا تھا۔ آپؐ جس طرف سے گزرتے ماتمی چیخ پکار کی آوازیں گھروں سے آتی ہُوئی سُنتے۔

عرب کا دستور تھا کہ مُردوں پر عورتیں زور زور سے نوحہ اور بَین کرتیں، کپڑے پھاڑ ڈالتیں، چہروں پر تھپیڑ مارتیں اور چیخیں چلاتیں۔ ماتم کا یہ دل دوز منظر دیکھ کر رقّت کے جوش میں حضورؐ کی زبانِ مبارک سے بے اختیار نکلا:

"حمزہ کا کوئی رونے والا نہیں۔"

انصارِ مدینہ یہ سُن کر تڑپ اُٹھے۔ اُنھوں نے اپنی عورتوں کو حکم دیا کہ وہ حضورؐ کے دولت کدہ پر جا کر حضرت حمزہؓ کا ماتم کریں۔ آپؐ گھر تشریف لائے، دیکھا دروازے پر عورتوں کی ایک بھیڑ جمع

ہے اور حضرت حمزہؓ کا ماتم بلند ہے۔

حضورؐ نے اُن کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا اور اُن کے حق میں دعائے خیر فرمائی۔ ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

"عرب کے قدیم رواج کے مطابق ماتم کرنا مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ آج سے کسی مُردے پر ماتم نہ کیا جائے۔" (بخاری)

تمام محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اُسی دن سے مُردے پر نوحہ وبین اور ماتم کی پُرانی رسم بند ہوگئی۔

سیدہ رقیہؓ کی وفات

حضورؐ ابھی بدر ہی کے میدان میں تھے کہ آپؐ کی پیاری بیٹی حضرت رقیہؓ چیچک کی بیماری سے رحلت فرما گئیں۔ جب اُن کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی عین اُس وقت حضرت زیدؓ بن حارثہ بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینے میں داخل ہُوئے۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی لختِ جگر کی وفات کی خبر پاکر بہت مغموم ہُوئے۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ آپؐ اپنی بیٹی کی قبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا:

"عثمان بن مظعون جا چکے ہیں۔ اب تم بھی اُن سے جا ملو۔"

حضرت عثمانؓ بن مظعون پہلے مہاجر تھے جنہوں نے مدینے میں آکر وفات پائی تھی۔

حضورؐ کے یہ رقت آمیز الفاظ سُن کر عورتوں نے ماتم کا ایک کہرام بپا کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے اُنہیں روکنا چاہا۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا:

"عمر! انہیں رونے دو۔ دل اور آنکھ کے رونے میں کوئی حرج نہیں، البتہ نوحہ اور بین سے بچنا چاہیے۔"

حضرت فاطمہ الزہراؓ بھی اپنی بہن کی قبر پر تشریف لائیں اور قبر کے پاس بیٹھ کر رونے لگیں۔ حضورؐ اپنی چادر سے اُن کے آنسو پونچھتے جاتے تھے۔

سیدہ اُمِ کلثومؓ موت کی آغوش میں

شعبان ۹ ھ میں آپؐ کی محبوب بیٹی حضرت اُمِ کلثوم، جو حضرت عثمانؓ کے نکاح میں تھیں، پیامِ اجل کو لبیک کہتے ہُوئے اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اُن کے کفن کے لیے حضورؐ نے اپنی چادر عنایت فرمائی۔ خود ہی نمازِ جنازہ پڑھائی۔ آپؐ کی اجازت سے حضرت علیؓ، حضرت ابوطلحہؓ، حضرت اسامہؓ اور حضرت فضلؓ بن عباسؓ نے سیدہ کو قبر میں اُتارا۔ جب سیدہ اُمِ کلثوم کو قبر میں اُتارا جا رہا تھا اُس وقت حضورؐ قبر کے پاس موجود تھے اور آپؐ کی آنکھوں سے سیلِ اشک رواں تھا۔

حضورؐ کا نواسہ عالمِ نزع میں

سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی سیدہ زینبؓ کا بچہ بیمار ہُوا۔ اُس کی حالت غیر ہوگئی۔ آپؐ کو اطلاع دی گئی۔ آپؐ اپنی بیٹی کے گھر تشریف لے گئے۔ حضرت سعدؓ بن وقاص آپؐ کے ہمراہ تھے۔ بچہ آپؐ کے پاس لایا گیا۔ اس پر سکرات کا عالم طاری تھا۔ لختِ جگر کی یہ حالت دیکھ کر آپؐ کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کی "یا رسول اللہ! یہ کیا؟"

آپؐ نے فرمایا: "یہ رحمت وشفقت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھی ہے۔ خدائے رحیم اپنے انہی بندوں پر رحم فرماتا ہے جو مہربان، شفیق اور رحمدل ہوتے ہیں۔" (بخاری ومسلم)

حضورؐ کا نورِ چشم، موت کے دروازے پر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند حضرت ابراہیم ماریہ قبطیہؓ کے بطن سے ۸ ھ میں پیدا ہُوئے۔ آپؐ کو اُن کی ولادت کی خوشی ہُوئی کہ پیدائش کی خبر لانے والے ابورافع کو بطورِ انعام ایک غلام عطا فرمایا اور اُن کی دایہ یعنی دُودھ پلانے والی اُمِ بردہ کو کھجوروں کا ایک باغ بخشا۔ حضرت ابراہیم کی عُمر ابھی ۱۶ ماہ ہی ہُوئی تھی کہ مالکِ حقیقی کی طرف سے بُلاوا آگیا۔ بیمار ہُوئے۔ حضورؐ کو خبر ملی اور اپنے بچے کے پاس گئے۔ اُن پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ حضورؐ نے اُنہیں اپنی گود میں لیا اور اُس نازنین نے اپنے عظیم باپ کی آغوشِ شفقت میں دم توڑا۔ آپؐ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو حضورؐ کے پاس موجود تھے، عرض کی "یا رسول اللہ! رونے سے تو آپؐ نے منع فرمایا تھا۔ آپؐ روئیں گے تو مسلمان بھی روئیں گے۔" جب آپؐ کے آنسو تھمے تو ارشاد فرمایا:

(باقی صفحہ ۸۵ پر)

مغل پورہ سروس اسٹیشن

مغلپورہ اور کینال روڈ کے سنگم پر
واقع پلاٹ نمبر ۲۸ پورس اسٹیشن سکیم

خصوصی رعایت برائے ریلوے

ذاتی گاڑی -/۳۰ روپے
سرکاری گاڑی -/۳۵ روپے
بجائے ~~۵۰~~

چیف پروپرائٹر: محمّد ریاض

A-One Autocable

وائی سی کیبل انڈسٹری کی کوالٹی پروڈکس

اسٹاکسٹ: آصف آٹوز۔ نظام آٹو مارکیٹ لاہور۔ فون ۲۰۲۱۶۶ / ۲۰۴۷۰۴

Seiko

BRAKE + CLUTCH LINING

میسی فرگوسن ٹریکٹر کے ہر ماڈل پرزہ جات کے ہول سیل ڈیلر

S SEIKO

سٹاکسٹ: طارق آٹوز ۱۳۔ نظام آٹو مارکیٹ بادامی باغ لاہور۔ فون: ۲۰۰۹۹۰

پاکستان کا
نمبر
1
بائیسکل
سُہراب

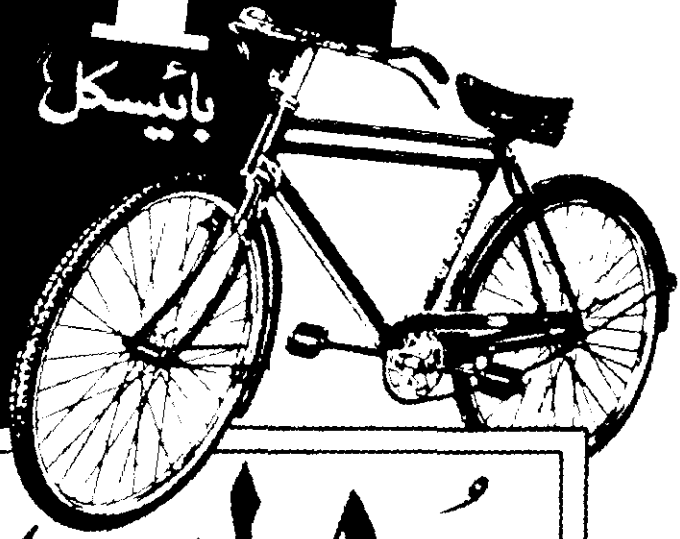

MONTHLY
MEESAQ
LAHORE

Regd. L. No. 7360
Vol. 36 No. 1
January — 1987

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اے اللہ . . . . .

ہم عاجز ہیں ——— تو قوی ہے
ہم ظالم ہیں ——— تو رحیم ہے
ہم گناہ گار ہیں ——— تو بخشنے والا ہے

ہم نے تجھ سے یہ ملک مانگا تھا کہ یہاں تیرے کلمے کو بلند کریں گے
تیری کتاب کے احکامات پر عمل کریں گے
تیرے آخری نبی اور رسُول صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سُنّت کی پیروی کریں گے
لیکن ہم نے ——— اُس عہد کو پامال کر دیا
ہم نے اپنی خواہشات اور مال و دولت کو اپنا معبود بنالیا
ہم تجھے بھول گئے
لیکن تو ہمیں فراموش نہ کر

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کر دے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

الداعی الی الخیر: میاں عبدالواحد
بھگوان سٹریٹ
پرانی انارکلی لاہور